معاملات (حصہ اول)

جلد: ۸

مفتی محمد تقی عثمانی

معاملات

جلد: ۸

مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی

ترتیب و تخریج

مولانا عنایت الرحمٰن

(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.
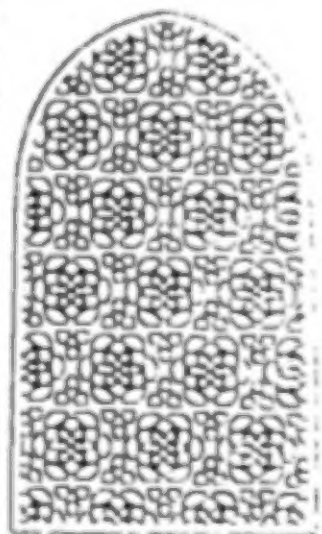
عرض ناشر: الحمد للہ اگرچہ مکتبۃ معارف القرآن کراچی نے "مواعظِ عثمانی" کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

باہتمام : خضر قاسمی

طبع جدید : جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ - دسمبر ۲۰۲۲ء

ناشر : مکتبۃ معارف القرآن کراچی

ترتیب و ڈیزائننگ : عمران خان

فون : (92-21) 35031565, 35123130

ای میل : info@mmqpk.com

ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com

آن لائن : fb/onlinesharia

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں

احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، پاکستان- 75180

آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے
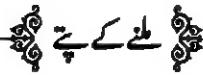
- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، کراچی/لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدرآباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمرگرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

پیشِ لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرّہٗ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت ''معارف القرآن'' کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کرلیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا جس کی اب غالباً ۲۵ جلدیں ہو چکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ وخطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کر کے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کر دیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج و تحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر اس بے عمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنا دیں اور اس سے عام و خاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

دار العلوم کراچی ۱۴

بندہ
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۵/محرم ۱۴۴۳ھ

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

زیرِ نظر کتاب سلسلہ ''مواعظِ عثمانی'' جلدِ ہشتم ''معاملات (حصہ اول)'' جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات، تقاریر اور مضامین کا تخریج شدہ جامع اور مستند موضوع وار مجموعہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ ربُّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہرِ معاشیاتِ اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعیٔ اسلام ہیں۔ اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ واری مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہو رہا ہے، جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔ اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء، طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات ومواعظ تحریراً اور تقریراً عوام الناس میں مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان سے مستفید ہو رہا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرست عنوانات

تفصیلی فہرست

تجارت اور تاجر سے متعلق ارشادات نبوی

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تجارت اور تاجر سے متعلق ارشادات نبوی

① حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سچا اور امانت دار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء، صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا''۔(۱)

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو نرم خو ہو، بیچتے وقت بھی خریدتے وقت بھی اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے وقت بھی''۔(۲)

---

(۱) سنن الترمذی ۴۹۸/۲ (۱۲۰۹) وقال هذا حدیث حسن ... الخ -طبع دار الغرب الاسلامی- وسنن ابن ماجہ ۵۱۰/۳ (۲۱۳۹) طبع دار الجیل بیروت۔

(۲) صحیح البخاری ۵۷/۳ (۲۰۷۶) طبع دار طوق النجاۃ۔

③ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''پچھلی امتوں میں سے ایک شخص کے پاس فرشتہ روح قبض کرنے آیا، پھر مرنے کے بعد اس سے پوچھا کہ کیا تم نے کوئی بھلائی کا عمل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، اس سے پھر کہا گیا کہ غور کر کے بتاؤ۔ اس نے پھر کہا کہ اس کے سوا مجھے اپنا کوئی نیک عمل معلوم نہیں کہ میں دنیا میں لوگوں کے ساتھ خرید و فروخت کرتا تھا تو حسنِ سلوک سے کام لیتا تھا، کوئی کشادہ حال ہوتا تو اسے مہلت دے دیتا اور کوئی تنگدست ہوتا تو اسے بالکل ہی معاف کر دیتا۔ اس پر اللہ نے اسے جنت میں داخل کر دیا''۔ (۱)

④ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بہترین کمائی ان تاجروں کی ہے جو بات کہیں تو جھوٹ نہ بولیں، امانت رکھیں تو خیانت نہ کریں، وعدہ کریں تو خلاف ورزی نہ کریں، کچھ خریدیں تو (سامان کی) مذمت نہ کریں، بیچیں تو (مبالغہ آمیز) تعریف نہ کریں، ان کے اوپر کسی کا حق واجب ہو تو ٹال مٹول نہ کریں اور ان کا حق کسی پر

(۱) صحیح البخاری ۵۷/۳ (۲۰۷۷)۔

واجب ہوتو اسے تنگ نہ کریں''۔ (۱)

⑤ حضرت ابوقتادۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بیع کے وقت زیادہ قسمیں کھانے سے بچو، اس لیے کہ اس سے (شروع میں) تجارت کچھ چمکتی ہے، لیکن پھر تباہی آتی ہے''۔ (۲)

⑥ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سارے تجّار قیامت کے دن فجار ہوکر اٹھائے جائیں گے، سوائے ان لوگوں کے جو اللہ سے ڈریں، نیکی کریں اور سچ بولیں''۔ (۳)

⑦ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور کسی مسلمان کے لیے حلال

---

(۱) شعب الایمان للبیهقی ٤٨٨/٦ (٤٥١٣) طبع مکتبة الرشد۔ والحدیث ذکرہ المنذری فی "الترغیب والترہیب" ٣٦٦/٢ ولم یتکلم علی إسنادہ۔ طبع دار الکتب العلمیة۔ وقال المناوی فی "التیسیر" ٣١١/١: باسناد ضعیف، طبع مکتبة الإمام الشافعی۔

(۲) صحیح مسلم ١٢٢٨/٣ (١٦٠٧) طبع دار احیاء التراث العربی۔

(۳) سنن الترمذی ٤٩٩/٢ (١٢١٠) وقال هذا حدیث حسن صحیح۔ وسنن ابن ماجه ٥١٥/٣ (٢١٤٦)۔

نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو عیب دار چیز بیچے اور اس کا
عیب بیان نہ کریں‘‘۔ (۱)

⑧ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’جو شخص ہمارے ساتھ ملاوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں
اور دھوکہ فریب کرنے والے جہنم میں ہوں گے‘‘۔ (۲)

⑨ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’جس قوم میں فحاشی کو ایسا فروغ ہوتا ہے کہ کھلم کھلا
بے حیائی ہونے لگے تو ان میں طاعون کی وبا پھوٹتی ہے اور
ایسے ایسے درد پیدا ہوتے ہیں جو ان کے اسلاف میں نہیں
تھے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، اسے قحط اور سخت
مشکلات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور ان کے حکمران ان پر
ظلم توڑتے ہیں اور جو قوم اپنے مال کی زکوۃ ادا نہیں کرتی

---

(۱) سنن ابن ماجه ۵۷۸/۳ (۲۲٤٦) ومسند احمد ٦٥۳/۲۸ (۱۷٤٥۱) طبع مؤسسه الرساله. والحديث ذكره الحافظ فى "فتح البارى" ۳۱۱/٤ وقال واسناده حسن۔ طبع دار المعرفة۔

(۲) المعجم الكبير للطبرانى ۱۳۸/۱۰ (۱۰۲۳٤)-طبع مكتبة ابن تيمية-والمعجم الصغير ۳۷/۲ (۷۳۸) طبع المكتب الاسلامى۔وقال المنذرى فى "الترغيب والترهيب" ۳٥۹/۲ رواه الطبرانى فى الكبير والصغير باسناد جيد وابن حبان فى صحيحه۔طبع دار الكتب العلمية۔

اس پر آسمان سے بارش بند کردی جاتی ہے اور اگر چوپائے نہ ہوں تو ان پر کبھی بارش نہ ہو اور جو قوم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑتی ہے، اللہ تعالیٰ غیروں میں سے اس پر دشمن مسلط کردیتا ہے، جو ان کے ہاتھ کی پونجی چھین لیتا ہے اور جب بھی کسی قوم کے حکام اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے اور اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام میں تردد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان خانہ جنگی پیدا کردیتا ہے''۔ (۱)

⑩ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص کسی مسلمان (کے کہنے پر اس) کے ہاتھ بیچی ہوئی کوئی چیز واپس کرلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی لغزشوں کو معاف فرمادے گا''۔ (۲)

⑪ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) سنن ابن ماجه ٥/٤٩٠ (٤٠١٩) وقال البوصيري فی "مصباح الزجاجه" ٤/١٨٦: رواه الحاكم أبو عبد اللّٰه الحافظ في كتابه المستدرك في آخر كتاب الفتن مطولا من طريق عطاء بن أبي رباح به، قال هذا حديث صحيح الإسناد، هذا حديث صالح للعمل به. (طبع دار العربية-بيروت).

(۲) سنن ابی داود ٣/٢٧٤ (٣٤٦٠) طبع المكتبة العصرية وسنن ابن ماجه ٣/٥٤٨ (٢١٩٩) وقال المنذری فی "الترغيب" ٣٥٦/٢: رواه أبو داود وابن ماجه وابن حبان في صحيحه واللفظ له والحاكم وقال صحيح على شرطهما.

ارشاد فرمایا:

''جو شخص مسلمان کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی کرے، اللہ تعالیٰ اسے جذام اور افلاس میں مبتلا کردے گا''۔ (۱)

⑫ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے راویت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص کسی خوراک کی چالیس دن تک ذخیرہ اندوزی کرے تو وہ اللہ سے بری اور اللہ اس سے بری ہے اور جن لوگوں کے صحن میں صبح کے وقت کوئی شخص بھوکا ہو، اللہ ان لوگوں سے بری الذمہ ہے''۔ (۲)

⑬ حضرت ابو ہریرۃ و معقل بن یسار رضی اللہ عنہما سے راویت ہے کہ حضور اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں دخل اندازی کرکے گرانی پیدا کرے تو اس کے بارے میں اللہ کو حق

---

(۱) سنن ابن ماجہ ۵۱۹/۲(۲۱۵۵) ومسند احمد ۲۸۳/۱(۱۳۵) وقال المنذری فی "الترغیب" ۳٦٤/۲: وهذا إسناد جيد متصل، ورواته ثقات، وقد أنكر على الهيثم روايته لهذا الحديث مع كونه ثقة، والله أعلم.

(۲) مسند احمد ٤٨١/٨ (٤٨٨٠)-طبع موسسة الرسالة- والمستدرك للحاكم ١٤/٢ (٢١٦٥)-طبع دار الكتب العليمة- وقال المنذری فی "الترغيب والترهيب" (٢/ ٣٦٣): رواه أحمد وأبو يعلى والبزار والحاكم، وفي هذا المتن غرابة، وبعض أسانيده جيد.

ہے کہ اس کو جہنم میں اوندھا کر کے پھینک دے"۔ (۱)

⑭ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب دو آدمی شرکت کا کاروبار کرتے ہیں تو میں ان کا تیسرا (شریک) بن جاتا ہوں (یعنی ان کی مدد کرتا ہوں) تاوقتیکہ ان میں سے کوئی ایک اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے، ہاں جب کوئی اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں"۔ (۲)

⑮ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اپنے کسی شریک کے ساتھ اس معاملے میں خیانت کرے جس میں شریک نے اس کو امانت دار سمجھا تھا اور اس کا نگران بنایا تھا تو میں اس سے بری ہوجاتا ہوں"۔ (۳)

---

(۱) وقال المنذری فی "الترغیب والترهیب"(۳٦٤/۲): ذكره رزين أيضا وهو مما انفرد به مهنأ بن يحيى، عن بقية بن الوليد، عن سعيد بن عبد العزيز، عن مكحول، عن أبي هريرة، وفي هذا الحديث والحديثين قبله نكارة ظاهرة، والله أعلم.

(۲) سنن ابی داود ۲٥٦/۳ (۳۳۸۳) والمستدرک للحاکم ٦۰/۲ (۲۳۲۲) وقال: وهذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه. وقال الذهبي في "التلخيص": صحيح.

(۳) ذكره ابن حجر الهيتمی فی الزواجر عن اقتراف الكبائر ٤۳۱/۱ باب الشركة والوكالة. وعزاه إلى أبی يعلى والبيهقی -طبع دار الفكر-

تجارت کی فضیلت
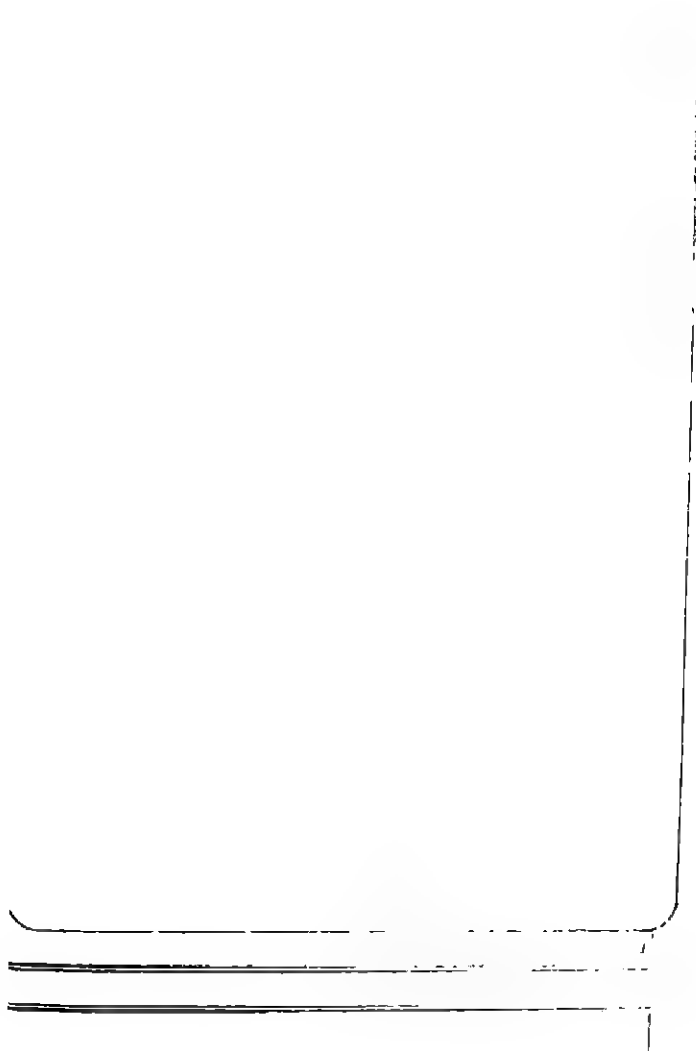
(اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱/ ۸۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تجارت کی فضیلت

قرآنِ کریم میں بکثرت یہ تعبیر آئی ہے کہ اللہ کا فضل تلاش کرو، اس تعبیر کی تفسیر اکثر حضرات مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد تجارت ہے گویا تجارت کو ''ابتغاء فضل اللہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اس سے تجارت کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔ تجارت کو محض دنیاوی کام نہ سمجھو، بلکہ یہ اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کے مترادف ہے۔

قرآن میں مال و دولت کے لیے کلمۂ خیر اور قباحت کا استعمال

دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں دنیا اور مال و دولت کے لیے بعض جگہ پر ایسے کلمات استعمال کیے گئے ہیں جو ان کی قباحت اور شناعت پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۱)

(۱) سورۃ الانفال آیت (۲۸)۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ [1]

اور ان کے لیے تعریفی کلمات بھی ہیں۔ جیسے:

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ [2]

اور ڈھونڈو فضل اللہ کا۔

یعنی تجارتی نفع، اس کو فضل اللہ سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور بعض جگہ مال کے لیے خیر کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جیسے:

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ [3]

حقیقت یہ ہے کہ (آدمی) مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔

الخیر یہاں مال کے معنی میں ہے [4]، تو ایک ظاہر بین انسان کو بعض اوقات ان دونوں قسم کی تعبیرات میں تعارض و تضاد محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تو کہہ رہے تھے کہ ''متاع الغرور'' یعنی دھوکہ کا سامان ہے اور ابھی کہہ رہے کہ فضل اللہ اور خیر ہے۔

حقیقت میں یہ تعارض نہیں، بلکہ یہ بتانا منظور ہے کہ دنیاوی مال و اسباب جتنے بھی ہیں یہ انسان کی حقیقی منزل اور منزلِ مقصود نہیں، بلکہ منزلِ مقصود آخرت اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ہے، اس دنیا میں زندہ رہنے کے

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۸۵)۔
(۲) سورۃ الجمعۃ آیت (۱۰)۔
(۳) سورۃ العادیات آیت (۸)۔
(۴) تفسیر الطبری ۲۴/۵۶۷ طبع موسسۃ الرسالۃ۔

لیے ان اسباب کی ضرورت ہے ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، لہٰذا جب تک انسان ان اسباب کو راستے کا ایک مرحلہ سمجھ کر استعمال کرے، منزلِ مقصود قرار نہ دے تو اس وقت تک یہ خیر ہے اور جب انسان ان کو منزلِ مقصود بنا لے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس منزلِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنا شروع کردے، تو یہ فتنہ اور متاع الغرور ہے، لہٰذا جب تک دنیا اور اس کا مال واسباب محض وسائل کے طور پر استعمال ہو اور اسے جائز حدود میں استعمال کیا جائے تو اس وقت تک اللہ کا فضل اور خیر ہے اور جب اس کی محبت دل میں گھر کر جائے اور انسان اس کو منزلِ مقصود بنا لے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہرجائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنا شروع کردے تو وہ فتنہ اور متاع الغرور یعنی دھوکے کا سامان ہے۔

دنیا میں مال واسباب کی مثال

علامہ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی پیاری مثال دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو دنیا کے مال واسباب جتنے بھی ہیں ان کی مثال پانی کی سی ہے اور تیری مثال اے انسان! کشتی کی سی ہے، کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی، کشتی کے لیے پانی اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک پانی کشتی کے چاروں طرف ہو، نیچے ہو، دائیں ہو، بائیں ہو، لیکن اگر پانی اندر آجائے تو اس کو ڈبو دے گا اور غرق کردے گا۔ ؎

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

جب تک پانی کشتی کے نیچے ہو تو اس کو سہارا دیتا ہے، اس کو آگے بڑھاتا ہے، اگر کشتی کے اندر گھس جائے تو کشتی کی ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے۔ پس یہی ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

حدیث میں ہے کہ

"التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ"(۱)

اور دوسری حدیث میں ہے کہ

"التُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ"(۲)

تو جو آدمی اس کو راستے کا مرحلہ سمجھے اور اللہ کی مقرر کردہ حدود میں اس کو استعمال کرے تو وہ نعمت اور فضل اللہ ہے اور جہاں آدمی اس کی محبت میں مبتلا ہو جائے اور اس کی وجہ سے حرام وحلال کی حدود کو پامال کردے تو وہ متاع الغرور ہے۔ قرآن وحدیث نے اس حقیقت کو سمجھایا ہے۔

مسلمان تاجر کا خاصہ

فرمایا کہ

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ

(۱) سنن الترمذی ۲/۴۹۸ (۱۲۰۹) وقال هذا حديث حسن. وسنن ابن ماجه ۳/۵۱۰ (۲۱۳۹)۔

(۲) سنن الترمذی ۲/۴۹۹ (۱۲۱۰) وقال هذا حديث حسن صحيح۔ وسنن ابن ماجه ۳/۵۱٤ (۲۱٤٦)۔

فَضْلِ اللّٰہِ (۱)

پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا۔

یعنی اللہ کا فضل تلاش کرو، تجارت کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تجارت کر رہے ہو تو بھی ذکر اللہ جاری رہنا چاہیے، کیونکہ اگر تجارت میں اللہ کی یاد فراموش ہوگئی اللہ کا ذکر نہ رہا، تو وہ تجارت تمہارے دل میں گھس کر تمہاری کشتی ڈبو دے گی، اس واسطے "وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ" کے ساتھ "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا" کا لاحقہ لگا دیا کہ تجارت کے ساتھ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۲)

یعنی مال و دولت اور اہل وعیال تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کردیں۔

مسلمان تاجر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ تجارت بھی کر رہا ہے، لیکن ؏

دست بکار و دل بیار

یعنی ہاتھ تو کام میں لگ رہا ہے، لیکن دل اللہ کی یاد میں لگا ہوا ہے، اسی کی صوفیاء کرام مشق کراتے ہیں اور تصوف اسی کا نام ہے کہ تجارت بھی کرو اور زیادہ

---

(۱) سورۃ الجمعۃ آیت (۱۰)۔

(۲) سورۃ المنافقون آیت (۹)۔

سے زیادہ ذکر اللہ بھی کرو۔ اب یہ کیسے کریں اور اس کی عادت کیسے ڈالیں؟ صوفیاء کرام اسی فن کو سکھاتے ہیں کہ تم تجارت بھی کررہے ہوگے اور اللہ کا ذکر بھی جاری رکھو گے۔

میرے دادا حضرت مولانا یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے ہم عمر تھے، یعنی جس سال دارالعلوم دیوبند قائم ہوا اسی سال ان کی ولادت ہوئی، ساری عمر دارالعلوم دیوبند میں گذاری، وہیں پڑھا اور وہیں پڑھایا، وہ فرماتے تھے کہ

> ''ہم نے دارالعلوم دیوبند میں وہ زمانہ دیکھا ہے کہ جب اس کے شیخ الحدیث سے لے کر اس کے دربان اور چپڑاسی تک سب صاحبِ نسبت ولی اللہ تھے''۔

چوکیدار چوکیداری کررہا ہے دروازے پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے لطائفِ ستہ جاری ہیں۔

دادا جی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور شیخ الہند سے ہی دورہ حدیث پڑھا تھا، فرماتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے منطق کی کتاب ملاحسن کا سبق پڑھتے تھے، حضرت سبق پڑھا رہے ہوتے تھے تقریر کررہے ہوتے تھے، تو ہمیں ان کے دل سے اللہ اللہ کی آواز آتی سنائی دیتی تھی۔ آیت کریمہ کا یہی مطالب ہے کہ اور یہی کچھ حضراتِ صوفیاء کرام سکھاتے ہیں کہ کس طرح تمہارا کام بھی چل رہا ہو اور اللہ کے ذکر کے ساتھ تم بھی مشغول ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بدعت نکال لی ہے، یہ کوئی بدعت وغیرہ نہیں، بلکہ اسی قرآن کی آیت

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۝ (۱)

اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو اور جب کچھ لوگوں نے کوئی تجارت یا کوئی کھیل دیکھا تو اُس کی طرف ٹوٹ پڑے اور تمہیں کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ کہہ دو: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل اور تجارت سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

پر عمل ہے۔

آیت کا شانِ نزول

اس آیت کا شانِ نزول بخاری (۲) میں کتاب الجمعہ میں ہے کہ حضورِ اکرم سرورِ دو عالم ﷺ جمعہ کے روز خطبہ فرما رہے تھے کہ اس وقت کچھ لوگ اونٹوں پر سامانِ تجارت لے کر آ گئے تو بعض حضرات اس کو دیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے کہ کیا سامان لے کر آئے ہیں، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جب وہ کوئی تجارت دیکھتے ہیں یا لہو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ کے چلے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، تو یہاں تجارت بھی ہے اور لہو بھی ہے۔

---

(۱) سورۃ الجمعة آیت (۱۰-۱۱)۔
(۲) صحیح البخاری ۲/۱۳ (۹۳۶)۔

لہو کی وضاحت

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''لہو'' کا لفظ تجارت کے لیے ہی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ تجارت انسان کو ذکر اللہ سے غافل کر دیتی ہے اس لیے وہ ''لہو'' بن جاتی ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''لہو'' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ سامانِ تجارت لے کر آئے تھے ان کے ساتھ ڈھول ڈھما کا بھی تھا تو وہ تجارت بھی اور ساتھ ''لہو'' بھی تھا، اس لیے دونوں کا ذکر فرمایا۔(۱)

الیھا کی ضمیر مفرد ہونے کی وجہ

''الیھا'' میں ضمیر صرف تجارت کی طرف لوٹائی ہے ورنہ ''الیھما'' کہتے، لیکن ضمیر مفرد کی لائے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہ ان کا مقصودِ اصلی تجارت کے لیے جانا تھا نہ کہ ''لہو'' کے واسطے تھا، بلکہ ''لہو'' ضمنی طور پر تھا۔

وَتَرَكُوكَ قَآئِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ

ابھی تو کہہ رہے تھے ''من فضل اللہ'' اور اب فرمارہے ہیں:

مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ

وہی بات آگئی کہ جب تک وہ تجارت تمہیں اللہ کے ذکر اور اس کے حکم

---

(۱) تفسیر طبری ۳۸۶/۲۳ وفتح الباری لابن حجر ۴۲۴/۲، طبع دار المعرفہ بیروت۔

سے غافل نہیں کر رہی تھی تو وہ فضل اللہ تھا، لیکن جب اس نے غافل کر دیا تو

مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ

بن گیا، اگر یہ اندیشہ ہو کہ اگر اللہ کے فلاں حکم پر عمل کریں گے -العیاذ باللہ- اس سے ہمارا نقصان ہو جائے گا تو یہ وہم شیطان کا ہے، یہ دل سے نکال دو کیونکہ "وَاللّٰہُ خَیْرُ الرَّازِقِیْنَ" ہے۔

ارشاد خداوندی ہے کہ

لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۱)

نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔

یہ آیت کریمہ بھی تجارت کے اصول بیان کر رہی ہے کہ باطل طریقے سے اموال کمانا حرام ہے اور صرف اس طرح حلال ہے جس میں دو شرطیں پائی جارہی ہوں، ایک یہ کہ تجارت ہو اور دوسرا یہ کہ باہمی رضامندی سے ہو۔

سودے کے صحیح ہونے کے لیے تنہا رضامندی کافی نہیں

معلوم ہوا کہ تنہا باہمی رضامندی کسی سودے کی حلت کے لیے کافی نہیں، باہمی رضامندی سے ایک سودا ہو گیا تو تنہا باہمی رضامندی کافی نہیں۔

---

(۱) سورۃ النساء آیت (۲۹)۔

إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔

اور تجارت سے مراد وہ معاملہ ہے جو اللہ کے نزدیک تجارت ہے۔ لہٰذا سود کا جو لین دین ہوتا ہے اس میں باہمی رضامندی سے وعدہ ہوتا ہے، باہمی رضامندی سے جوئے کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور سٹے کا معاملہ بھی ہوتا ہے، لیکن یہ سب ممنوع ہے، اس واسطے کہ یہ اگرچہ باہمی رضامندی تو ہے، لیکن تجارت نہیں ہے اور اگر تجارت ہو، لیکن باہمی رضامندی نہ ہو تو یہ بھی حرام ہے، تو بیک وقت دو شرطیں ہیں:

تجارت بھی ہو اور باہمی رضامندی بھی ہو۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

تجارت دین بھی دنیا بھی

(اصلاحی خطبات ۳/ ۲۸۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجارت دین بھی دنیا بھی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (۱)

وقال رسول اللہ ﷺ: «اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الأَمِیْنُ

(۱) سورۃ التوبۃ آیت (۱۱۹)۔

مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ"(۱)

وقال رسول الله ﷺ: "التجار يحشرون يوم القيامة فجارا الا من اتقى الله وَبَرَّ وَصَدَقَ"(۲)

امنت بالله صدق الله مولانا العظيم، وصدق رسوله النبي الكريم، ونحن على ذٰلك من الشاهدين والشاكرين، والحمد لله رب العالمين

مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! پہلے بھی ایک مرتبہ بھائی امان اللہ صاحب کی دعوت پر میری یہاں حاضری ہوچکی ہے اور یہ ان کی اور دوستوں کی محبت کی بات ہے کہ دوبارہ ایک ایسا اجتماع انہوں نے منعقد فرمایا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ پچھلی مرتبہ جس طرح کچھ سوالات کیے گئے تھے، جن کا میری اپنی ناقص معلومات کی حد تک جو جواب بن پڑا، وہ دیا تھا، خیال یہ تھا کہ آج بھی اسی قسم کی مجلس ہوگی، کوئی تقریر یا بیان پیشِ نظر نہیں تھا، لیکن بھائی صاحب فرمارہے ہیں کہ ابتداء میں دین کی اور ایمان ویقین کی باتیں ہوجائیں، تو دین کی بات بیان کرنے سے تو کبھی انکار نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ دین ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پتھر کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

(۱) سنن الترمذی ۴۹۸/۲ (۱۲۰۹) وقال ھذا حدیث حسن۔

(۲) سنن الترمذی ۴۹۹/۲ (۱۲۱۰) وقال ھذا حدیث حسن صحیح۔

تاجروں کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ

اس مجمع میں جو دوست واحباب موجود ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق چونکہ تجارت سے ہے اس لیے اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں میرے ذہن میں آئیں اور پھر قرآنِ کریم کی ایک آیت بھی میں نے تلاوت کی، جس سے ان دونوں حدیثوں کے مضمون کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ دونوں حدیثیں بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں، ایک حدیث میں نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الأَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاء"

جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، یہ تجارت جس کو ہم اور آپ دنیا کا ایک کام سمجھتے ہیں اور دل میں یہ خیال رہتا ہے کہ یہ تجارت ہم اپنے پیٹ کی خاطر کررہے ہیں اور اس کا بظاہر دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تاجر میں دو باتیں پائی جائیں، ایک یہ کہ وہ صدوق ہو اور امین ہو۔ صدوق کے لفظی معنی ہیں "سچا" اور امین کے معنی ہیں "امانت دار" دوسرا یہ کہ اگر یہ دو صفتیں اس میں پائی جائیں تو قیامت کے دن وہ انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا، ایک سچائی اور ایک امانت۔

تاجروں کا حشر فاجروں کے ساتھ

اور دوسری حدیث جو بظاہر اس کے متضاد ہے وہ یہ ہے کہ

"التجار یحشرون یوم القیامة فجارا الا من اتقی وبر وصدق"

''تجار'' قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے، ''فجار'' فاجر کی جمع ہے۔

یعنی فاسق وفاجر اور گناہ گار، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی معصیتوں کا ارتکاب کرنے والا ہے، سوائے اس شخص کے جو تقویٰ اختیار کرے اور نیکی اختیار کرے اور سچائی اختیار کرے۔

تاجروں کی دو قسمیں

یہ دونوں حدیثیں انجام کے لحاظ سے بظاہر متضاد نظر آتی ہیں کہ پہلی حدیث میں فرمایا کہ نبیوں کے ساتھ ہوں گے، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوں گے اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ فساق اور فجار کے ساتھ ہوں گے، لیکن الفاظ کے ترجمہ ہی سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ حقیقت میں دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ تاجروں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک قسم وہ ہے جو انبیاء اور صدیقین کے ساتھ ہوگی اور ایک قسم وہ ہے جو فاجروں اور فاسقوں کے ساتھ ہوگی۔

اور دونوں قسموں میں فرق بیان کرنے کے لیے جو شرائط بیان فرمائیں وہ یہ ہیں کہ سچائی ہو، امانت ہو، تقوی ہو، نیکی ہو تو پھر وہ تاجر پہلی قسم میں داخل ہے اور اس کو انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور اگر یہ شرائط اس کے اندر نہ ہوں، بلکہ صرف پیسہ حاصل کرنا مقصود ہو جس طرح بھی ممکن ہو چاہے دوسرے کی جیب

پر ڈاکہ ڈال کر ہو، دھوکہ دے کر ہو، فریب دے کر ہو، جھوٹ بول کر ہو، دغا دے کر ہو، کسی بھی طریقے سے ہو تو پھر وہ تاجر دوسری قسم میں داخل ہے کہ اس کو فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

تجارت جنت کا سبب یا جہنم کا سبب

اگر ان دونوں حدیثوں کو ہم ملا کر دیکھیں تو بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو تجارت ہم کر رہے ہیں، لیکن اگر ہم چاہیں تو اس تجارت کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بنالیں، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں اور اگر چاہیں تو اسی تجارت کو جہنم کا راستہ بنالیں اور فساق وفجار کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس دوسرے انجام سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین۔

ہر کام میں دو زاویے

اور یہ بات صرف تجارت کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ دنیا میں جتنے کام ہیں خواہ وہ ملازمت ہو، خواہ وہ تجارت ہو، خواہ وہ زراعت ہو یا کوئی اور دنیا کا کام ہو ان سب میں یہی بات ہے کہ اگر اس کو انسان ایک زاویے سے اور ایک طریقے سے دیکھے تو وہ دنیا ہے اور اگر دوسرے زاویے سے دیکھے تو وہی دین بھی ہے۔

زاویہ نگاہ بدل دیں

یہ دین درحقیقت صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، اگر آپ وہی کام دوسرے زاویے سے کریں، دوسری نیت سے کریں، دوسرے ارادے سے

کریں، دوسرے نقطۂ نظر سے کریں تو وہی چیز جو بظاہر ٹھیٹھ دنیاوی چیز نظر آرہی تھی دین بن جاتی ہے۔

کھانا کھانا عبادت ہے

اگر انسان کھانا کھا رہا ہے تو بظاہر انسان اپنی بھوک دور کرنے کے لیے کھانا کھا رہا ہے، لیکن اگر کھانا کھاتے وقت یہ نیت ہو کہ میرے نفس کا مجھ پر حق ہے، میری ذات کا، میرے وجود کا مجھ پر حق ہے اور اس حق کی ادائیگی کے لیے میں یہ کھانا کھا رہا ہوں اور اس لیے کھا رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا حق یہ ہے کہ میں اس کی طرف اشتیاق کا اظہار کروں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو استعمال کروں تو وہی کھانا جو بظاہر لذت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور بظاہر بھوک دور کرنے کا ذریعہ تھا پورا کھانا دین اور عبادت بن جائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور سونے کی تتلیاں

لوگ سمجھتے ہیں کہ دین یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو، بس یہی دین ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کا نام آپ نے سنا ہوگا، کون مسلمان ہے جو ان کے نام سے واقف نہیں ہے، بڑے زبردست پیغمبر اور بڑی ابتلاء اور آزمائش سے گزرے ہیں، ان کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ وہ غسل کر رہے تھے اور غسل کے دوران آسمان سے ان پر سونے کی تتلیوں کی بارش شروع ہوگئی، تو حضرت ایوب علیہ السلام

غسل کو چھوڑ چھاڑ کر ان تتلیوں کو پکڑنے اور جمع کرنے میں لگ گئے، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ایوب! کیا ہم نے تم کو پہلے ہی بے شمار نعمتیں نہیں دے رکھی ہیں؟ تمہاری ضروریات کا سارا انتظام کر رکھا ہے، ساری کفالت کر رکھی ہے، پھر بھی تمہیں حرص ہے اور تتلیوں کو جمع کرنے کی طرف بھاگ رہے ہو؟ تو حضرت ایوب علیہ السلام نے کیا عجیب جواب دیا کہ اے پروردگار!

"لا غنی بی عن برکتك"(۱)

جب آپ میرے اوپر کوئی نعمت نازل فرمائیں تو یہ بات ادب کے خلاف ہے کہ میں اس سے بے نیازی کا اظہار کروں، جب آپ خود اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرما رہے ہیں تو اب اگر میں بیٹھا رہوں اور یہ کہوں کہ مجھے یہ سونا چاندی نہیں چاہیے میں تو اس پر ٹھوکر مارتا ہوں تو یہ بے ادبی کی بات ہے، جب آپ دے رہے ہیں تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اشتیاق کے ساتھ اس کو لوں، اس کی قدر پہچانوں اور اس کا شکریہ ادا کروں، اس لیے میں آگے بڑھ کر ان کو جمع کر رہا ہوں، یہ ایک پیغمبر کی آزمائش تھی، ورنہ اگر عام قسم کا خشک دیندار ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، میں تو اس دنیا کو ٹھوکر مارتا ہوں، لیکن وہ چونکہ حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہی چیز اگر اس نقطہ نظر سے حاصل کی جائے کہ میرے پروردگار کی دی ہوئی ہے اور اس کی نعمت ہے میں اس کی قدر پہچانوں، اس کا شکر ادا کروں تو پھر یہ دنیا نہیں ہے، بلکہ یہ دین ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۴۳/۹ (۷۴۹۳)۔

نگاہ نعمت دینے والے کی طرف ہو

ہم لوگ پانچ بھائی تھے اور سب برسرِ روزگار اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، کبھی کبھی عید وغیرہ کے موقع پر جب ہم اکٹھے ہوتے تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات ہمیں عیدی دیا کرتے تھے، وہ عیدی کبھی ۲۰ روپے، کبھی ۲۵ روپے اور کبھی ۳۰ روپے ہوتی، مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب ۲۵ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ نہیں، ہم ۳۰ روپے لیں گے اور جب وہ ۳۰ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ نہیں، ہم ۳۵ روپے لیں گے اور تقریباً یہ صورت ہر گھر میں ہوتی ہے کہ اولاد چاہے جوان ہوگئی ہو، برسرِ روزگار ہوگئی ہو، کما رہی ہو، لیکن اگر باپ دے رہا ہے تو اس سے مچل مچل کر مانگتے ہیں کہ اور دے دیں اور اب وہ باپ کی طرف سے جو ۳۰ روپے دیے گئے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لیے کہ ہم میں سے ہر بھائی ہزاروں روپے کمانے والا تھا، لیکن پھر اس ۳۰ روپے کا شوق، رغبت اشتیاق اور اس کو حاصل کرنے کے لیے بار بار مچلنا یہ سب کیوں تھا؟ بات دراصل یہ ہے کہ نگاہ اس روپے پر نہیں تھی کہ ۳۰ روپے مل رہے ہیں، بلکہ نگاہ اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی کہ وہ ۳۰ روپے کس دینے والے ہاتھ سے مل رہے ہیں، یہ ایک باپ کی طرف سے مل رہے ہیں اور یہ ایک محبت کا اظہار ہے، یہ ایک شفقت کا اظہار ہے، یہ ایک نعمت کا اظہار ہے، لہٰذا اس کا ادب یہ ہے کہ اس کو اشتیاق کے ساتھ لیا جائے، اس کی قدر پہچانی جائے، چنانچہ اس کو خرچ نہیں کرتے تھے، بلکہ اٹھا کر لفافے میں بند کر کے رکھ دیتے کہ یہ میرے باپ کے دیے ہوئے ہیں، اگر وہی ۳۰ روپے کسی دوسرے آدمی کی طرف سے ملیں اور انسان اس میں لالچ اور رغبت کا اظہار کرے اور اس سے کہے کہ مجھے ۳۰ روپے کے بجائے ۳۵ روپے دو، تو یہ شرافت اور مروت کے خلاف ہے۔

اس کا نام تقویٰ ہے

دین درحقیقت زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے اور یہی زاویۂ نگاہ جب بدل جاتا ہے تو قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی میں دنیا کے اندر جو کچھ کر رہا ہوں، چاہے کھا رہا ہوں، چاہے سو رہا ہوں، چاہے کما رہوں، اللہ کے لیے کر رہا ہوں، اللہ کے احکام کے مطابق کر رہا ہوں، اللہ کی مرضی پیشِ نظر رکھ کر کر رہا ہوں، یہی چیز اگر حاصل ہوجائے تو اسی کو تقویٰ کہتے ہیں، یہ تقوی اگر پیدا ہوجائے اور پھر اس تقوی کے ساتھ تجارت کریں، تو یہ تجارت دنیا نہیں، بلکہ دین ہے اور یہ جنت تک پہنچانے والی ہے اور نبیوں کے ساتھ حشر کرانے والی ہے۔

صحبت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے

عموماً دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقوی کس طرح حاصل ہو؟ یہ زاویۂ نگاہ کس طرح بدلا جائے؟ تو اس کے جواب کے لیے میں نے شروع میں یہ آیت تلاوت کی تھی کہ

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾ (1)

اے ایمان والو! تقوی اختیار کرو اور قرآنِ کریم کا اصول یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس پر عمل کرنے کا راستہ بھی بتاتا ہے اور ایسا راستہ بتاتا ہے جو ہمارے اور آپ کے لیے آسان ہوتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ محض کسی کام کا حکم نہیں دیتے، بلکہ ساتھ میں ہماری ضروریات، ہماری حاجتیں اور ہماری کمزوریوں کا احساس فرما کر ہمارے لیے

---

(1) سورۃ التوبۃ آیت (۱۱۹)۔

آسان راستہ بھی بتاتے ہیں۔ تو تقویٰ حاصل کرنے کا آسان راستہ بتا دیا کہ "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو، یہ صحبت جب تمہیں حاصل ہوگی تو اس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر خود تقویٰ پیدا ہوجائے گا، ویسے کتاب میں تقویٰ کی شرائط پڑھ کر تقویٰ اختیار کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ راستہ بہت مشکل نظر آئے گا، لیکن قرآن نے اس کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ بتلا دیا کہ جس شخص کو اللہ نے تقویٰ کی دولت عطا فرمائی ہو دوسرے لفظوں میں جس کو صدق کی دولت حاصل ہو اس کی صحبت اختیار کرلو، کیونکہ صحبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس کی صحبت اختیار کی جاتی ہے اس کا رنگ رفتہ رفتہ انسان پر چڑھ جاتا ہے۔

ہدایت کے لیے صرف کتاب کافی نہیں ہوتی

اور دین کو حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کا بھی یہی راستہ ہے، نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ اسی لیے تشریف لائے، ورنہ سیدھی بات تو یہ تھی کہ صرف قرآنِ کریم نازل کردیا جاتا اور مشرکینِ مکہ کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ ہمارے اوپر قرآنِ کریم کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کتاب اس طرح نازل کردیتے کہ جب لوگ صبح بیدار ہوتے تو ہر شخص بہت اچھا اور خوبصورت بائنڈنگ شدہ قرآنِ کریم اپنے سرہانے موجود پاتا اور آسمان سے آواز آجاتی کہ یہ کتاب تمہارے لیے بھیج دی گئی ہے، اس پر عمل کرو تو یہ کام اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب رسول کے بغیر نہیں بھیجی، ہر کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجا ہے، رسول تو کتاب کے بغیر آئے ہیں، لیکن کتاب بغیر رسول کے نہیں آئی، کیوں؟ اس

لیے کہ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اور اس کو کسی خاص رنگ پر ڈھالنے کے لیے صرف کتاب کافی نہیں ہوتی۔

صرف کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننے کا نتیجہ

اگر کوئی شخص چاہے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتاب پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں اور پھر اس نے وہ کتاب پڑھ لی اور اس کو سمجھ بھی لیا اور اس کے بعد اس نے ڈاکٹری اور علاج شروع کردیا تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے وہ کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا، جب تک وہ کسی ڈاکٹر کی صحبت اختیار نہ کرے اور اس کے ساتھ کچھ مدت تک رہ کر کام نہ کرے اس وقت تک وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا اور میں تو آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ بازار میں کھانا پکانے کی کتابیں موجود ہیں جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں، پلاؤ اس طرح بنتا ہے، بریانی اس طرح بنتی ہے، قورمہ ایسے بنتا ہے۔ اب اگر ایک شخص صرف وہ کتاب اپنے سامنے رکھ کر بریانی بنانا چاہے گا تو خدا جانے وہ کیا ملغوبہ تیار کرے گا، جب تک کہ کسی ماہر کے ساتھ رہ کر اس کی ٹریننگ حاصل نہ کی ہو اور اس کو سمجھا نہ ہو اس وقت تک وہ بریانی تیار نہیں کرسکتا۔

متقی کی صحبت اختیار کرو

یہی معاملہ دین کا ہے کہ صرف کتاب انسان کو کسی دینی رنگ میں ڈھالنے کے لیے کافی نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی معلم اور مربی اس کے ساتھ نہ ہو، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام کو یہ مرتبہ حاصل

ہوا، صحابہ کے کیا معنی ہیں؟ صحابہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی صحبت اٹھائی، انہوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ نبی کریم ﷺ کی صحبت سے حاصل کیا، پھر اسی طرح تابعین نے صحابہ کی صحبت سے اور تبع تابعین نے تابعین کی صحبت سے حاصل کیا، تو جو کچھ دین ہم تک پہنچا ہے وہ صحبت کے ذریعے پہنچا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی تقوی حاصل کرنے کا راستہ یہ بتایا کہ کسی متقی کی صحبت اختیار کرو اور پھر اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے اندر بھی وہ تقوی پیدا فرمادیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی حقیقت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین
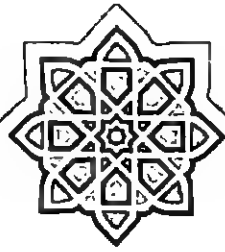
تجارت کے آداب

(انعام الباری ۶/ ۱۲۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تجارت کے آداب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ، قال ﷺ: «رحم الله رجلا سمحا إذا باع، وإذا اشترى، وإذا اقتضى».[1]

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

اللہ تبارک وتعالیٰ رحم فرماتے ہیں اس شخص پر جو بیچتے وقت بھی اور خریدتے وقت بھی اور اپنا حق وصول کرتے وقت بھی نرم ہو۔

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ آدمی پیسے پر جان دے۔ کوئی خریدار

(۱) صحیح البخاری ۳/۵۷ (۲۰۷۶)۔

خریداری کے لیے آیا ہے، آپ نے اس کی قیمت بتائی اور وہ اس قیمت کو ادا کرنے کا اہل نہیں ہے، تو آپ اس کے ساتھ کچھ نرمی کردیں، یعنی اپنا نقصان نہ کرے، لیکن اپنے منافع میں سے کچھ کم کردیں تو یہ "سمحا إذا باع" ہے، یہ نہیں کہ صاحب قسم کھا کے بیٹھ گیا کہ میں تو اتنے ہی میں دوں گا چاہے کچھ بھی ہوجائے، تو اگر حالات ایسے ہیں کہ دیکھ رہا ہے کہ یہ خریدار ضرورت مند ہے اور پیسے اس کے پاس نہیں ہیں تو اس کے لیے نرمی کا معاملہ کرو۔

"وإذا اشتری" اور اسی طرح چاہیے کہ خریداری کے وقت بھی نرم ہو، یعنی یہ نہیں کہ پیسے پر جان دے رہا ہو اور پیسے کم کرانے میں شام تک حجت بازی کر رہا ہے اور اڑا ہوا ہے کہ نہیں کم کرو ضرور کم کرو، بائع کے سر پر سوار ہوگیا تو یہ طریقہ مومن کا نہیں، اگر آپ کم کرانا چاہتے ہو تو ایک دو مرتبہ اس سے کہہ دو کہ بھائی اگر اس میں دے سکتے ہو تو دے دو، مان لے تو ٹھیک اور نہ مانے تو بھی ٹھیک ہے، اگر اتنے پیسے دے سکتے ہو تو دے دو اگر نہیں تو خریداری نہ کرو، اس کے اوپر لڑائی کرنا یا مسلط ہوجانا یہ صحیح نہیں ہے۔

دکاندار سے زبردستی پیسے کم کراکے کوئی چیز خریدنا جائز وحلال نہیں

آج کل رواج ہے کہ زبردستی پیسے کم کروائے جاتے ہیں۔ مثلاً: فرض کریں کہ آدمی دوسرے کے سر پر سوار ہو کر اس کو بالکل ہی زچ کردے یہاں تک کہ اس کے پاس چارہ ہی نہ رہا تو اس نے کہا کہ چلو بھئی اس بلا کو دفع کرو چاہے پیسوں کا کچھ نقصان ہی ہوجائے، یہ کہہ کر اگر دکاندار مال دے دے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ چیز آپ کے لیے حلال بھی نہیں ہوگی، اس لیے کہ

"لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منه"(۱)

کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر لے گا حلال نہیں۔

لہٰذا آپ نے تو اس سے زبردستی کم کرایا ہے، طیبِ نفس اس کا نہیں تھا لہٰذا حلال بھی نہیں ہوگا اس لیے کم کرانے کے لیے زیادہ اصرار کرنا اور زیادہ پیچھے پڑنا مومن کی شان نہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جو وصیت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو فرمائی اس میں ایک وصیت یہ بھی ہے کہ اور لوگوں میں تو یہ ہے کہ "سمحا إذا اشترى"، لیکن اہلِ علم کو چاہیے کہ وہ دوسروں سے زیادہ دیں۔

"واذا دخلت الحمام فلا تساو الناس فی المجلس وأجرة الحمام بل رجح على ما تعطى العامة لتظهر مروتك بينهم فيعظمونك"(۲)

یعنی جب تم حمام جاؤ تو عام لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور اجرت دینے کے معاملے میں برابری نہ کرو، بلکہ عام لوگ جتنی اجرت دیں، تم اس سے زیادہ دو، اس سے لوگوں میں تمہاری

---

(۱) مسند ابی یعلی ۳/ ۱٤۰ (۱۵۷۰)-طبع دار المامون للتراث دمشق- وقال الهيثمي في "المجمع" ٤/ ۳۰۵ (٦٨٦٦): رواه أبو يعلى، وأبو حرة وثقه أبو داود، وضعفه ابن معين.

(۲) الاشباه والنظائر لابن نجیم ص ۳۷۲ وصية الامام الاعظم لابی یوسف- طبع دار الكتب العلمية۔

قدر ومنزلت ظاہر ہوگی اور لوگ تمہاری عزت کریں گے۔

یہ بھی دین کے مقاصد میں داخل ہے

فرض کریں کہ کسی سواری کا کرایہ ہے تو دوسرے لوگ جتنے دیتے ہیں (اہلِ علم) اس سے کچھ زیادہ دے دیں تاکہ ان کی قدر ومنزلت دل میں قائم رہے، اہلِ علم کی قدر ومنزلت قائم رہنا یہ بھی دین کے مقاصد میں سے ہے اور اگر تم دوسروں سے کم دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مولوی کی شکل دیکھ کر وہ بھاگے گا کہ یہ مولوی آگیا ہے میرے اوپر مصیبت بنے گا اور مجھے پیسے پورے نہیں دے گا، اس کے برخلاف دوسروں سے زائد دو گے تو تمہاری قدر ومنزلت پیدا ہوگی۔

یہ سب دین کی باتیں ہیں یہ اخلاقِ نبوی ہیں جن کو حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے کہ اپنے عام معاملات میں آدمی نرمی کا برتاؤ کرے، اگر پیسے نہیں ہیں اور ضرورت کی چیز نہیں ہے تو مت خریدیں، لیکن زبردستی کرنا یا لڑنا جھگڑنا یہ مؤمن کا شیوہ نہیں ہے۔

حق مانگنے میں نرمی کریں

"واذا اقتضی" یعنی جب اپنا حق کسی سے مانگے تو اس میں بھی نرم ہو، یعنی تمہارا حق ہے وہ مانگ رہے ہو تو جیسا ابھی عرض کیا کہ مانگو، لیکن نرمی کے ساتھ، اگر دوسرے آدمی کو کوئی عذر ہے تو اس عذر کا لحاظ کرو اور اس کا بہترین اصول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا کہ جب بھی کسی شخص سے معاملہ کرو تو

معاملہ کرتے وقت اس کو اپنی جگہ بٹھا لو اور اپنے آپ کو اس کی جگہ بٹھا لو اور یہ سوچو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا پسند کرتا، تو جو معاملہ تم اپنے حق میں پسند کرتے ہو وہی معاملہ اس کے ساتھ کرو۔

"أحب لأخيك ما تحب لنفسك"(۱)

اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

یہ نہیں کہ دو پیمانے بنا لیے ہیں، ایک پیمانہ اپنے لیے اور ایک پیمانہ دوسروں کے لیے، بلکہ ایک ہی پیمانے سے اپنے عمل کو بھی اور دوسرے کے عمل کو بھی ناپو۔

زرّیں اصول

یہ ایسا زرّیں اصول ہے کہ اگر آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کرے تو نہ جانے کتنی لڑائیاں، جھگڑے، طوفان اور بدتمیزیاں ختم ہو جائیں، یعنی معاملات کے وقت اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو جتنا اصرار میں کر رہا ہوں اگر یہ مجھ سے اتنا اصرار کرتا تو کیا میں اس کو پسند کرتا، اگر نہ کرتا تو مجھے بھی اس کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے۔

"رحم الله رجلا سمحا إذا باع، وإذا اشترى، وإذا اقتضى"

کا یہی مطلب ہے۔

مؤمنوں کی تجارت، کاروبار اور ان کے معاملات غیر مسلموں سے کچھ تو

(۱) رواه عبد الله بن احمد في زياداته على مسند احمد ۲۷/۲۱٦ (۱٦٦۵۵)، وأورده الهيثمي في "المجمع" ۸/۳۳۹ (۱۳٦٦۷) وقال: ورجاله ثقات.

ممتاز ہوں پتہ چلے کہ ہاں یہ مؤمن کا کام ہے، یہ بھی معلوم ہو کہ میں کسی مسلمان سے معاملہ کر رہا ہوں اور مسلمان بھی اگر اہلِ علم ہو تو اس کا تو اور زیادہ بڑا مرتبہ ہے، اس واسطے اس کو دوسروں کی بنسبت اور زیادہ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

دنیا میں تاجروں کے ذریعے اشاعتِ اسلام

دنیا کے بہت سے حصوں میں تاجروں کے ذریعے اسلام پھیلا، کیونکہ اس کے لیے باقاعدہ کوئی جماعت نہیں گئی تھی کہ جو جا کے لوگوں کو دعوت دے، تاجر تھے تجارت کرنے گئے تھے لوگوں نے ان کے تجارتی معاملات کو دیکھا اور مشاہدہ کیا کہ یہ کیسے با اخلاق لوگ ہیں ان کو دیکھ کر مسلمان ہوئے۔

آج مسلمان چلا جائے، لوگ ڈرتے ہیں کہ اس کے ساتھ معاملہ کیسے کریں، دھوکہ یہ دے گا، فریب یہ کرے گا، جھوٹ یہ بولے گا، بدعنوانیوں کا ارتکاب یہ کرے گا اور جو باتیں ہماری تھیں وہ غیر مسلموں نے اپنا لیں۔ تو اس کے نتیجے میں اللہ نے دنیا میں ان کو کم از کم فروغ دے دیا، اب بھی امریکہ میں یہ صورتِ حال ہے کہ آپ ایک دوکان سے کوئی سودا خریدنے کے لیے گئے، ہفتہ گزر گیا ایک ہفتہ گذرنے کے بعد آپ دکاندار کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ بھائی یہ جو سیٹ میں نے لیا تھا یہ میرے گھر والوں کو پسند نہیں آیا اگر اس چیز میں کوئی نقص پیدا نہ ہو تو کہتے ہیں لاؤ کوئی بات نہیں واپس کر لیں گے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"من أقال نادما بيعته أقال الله عثرته يوم القيامة"(1)

(۱) سنن ابی داود ۲۷٤/۳ (۳٤٦۰) ومستدرک حاکم ۵۲/۲ (۲۲۹۱) قال الحاکم: ہذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ، ووافقہ الذہبی فی "التلخیص".

یعنی جس نے ندامت کرنے والے کی بیع کا اقالہ کیا تو اللہ تعالیٰ
قیامت کے دن اس کی لغزشوں کو معاف کردے گا۔

ہمارے ہاں اگر واپس کرنے کے لیے جائے تو جھگڑا ہو جائے گا جبکہ وہ واپس کر لیتے ہیں۔

ان اصولوں کی پابندی غیر مسلم تاجروں کے ہاں ہے

امریکہ سے پاکستان ٹیلیفون کیا اور آپ نے ایک ڈیڑھ منٹ بات کی، اس کے بعد ایکسچینج کو فون کردیں کہ میں نے فلاں نمبر پر فون کرنا چاہا تھا مجھے رانگ نمبر مل گیا جس نمبر کو میں چاہ رہا وہ نمبر نہیں ملا، تو کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہم آپ کے بل سے یہ کال کاٹ دیں گے۔ اب ہمارے پاکستانی بھائی پہنچ گئے تو انہوں نے ٹائپ رائٹر خریدا مہینے بھر اس کو استعمال کیا، اس سے اپنا کام نکالا ایک مہینے کے بعد جا کر کہا کہ پسند نہیں آیا، لہٰذا واپس لے لیں، شروع شروع میں انہوں نے واپس لے لیا، لیکن دیکھا کہ لوگوں نے یہ کاروبار ہی بنا لیا تو اب یہ معاملہ ختم کر دیا۔

ایک واقعہ

میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، میں لندن سے کراچی واپس آرہا تھا اور لندن کا جو ہیتھرو ایئرپورٹ ہے، وہاں ایئر پورٹ پر بہت بڑا بازار ہے، مختلف اسٹال وغیرہ لگے رہتے ہیں۔ اس میں دنیا کی مشہور کتاب ''انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا'' کا اسٹال لگا ہوا تھا، میں وہاں کتابیں دیکھنے لگا تو مجھے ایک کتاب نظر

آئی، جس کی بہت عرصے سے میں تلاش میں تھا، اس کا نام ''گریٹ بکس'' ہے۔ انگریزی میں پینسٹھ (۶۵) جلدوں میں ہے۔ اس کتاب میں ''ارسطو'' سے لے کر ''برٹرینڈ رسل'' تک جو ابھی قریب میں فلسفی گزرا ہے، یعنی تمام فلسفیوں اور تمام بڑے بڑے مفکرین کے اہم ترین کتابیں جمع کردیں اور سب کے انگریزی ترجے اس کتاب میں موجود ہیں، میں وہ کتاب اسٹال پر دیکھنے لگا، اسٹال پر جو آدمی (Shopkeeper) یعنی دوکاندار کھڑا تھا، کہنے لگا کہ کیا آپ یہ کتاب لینا چاہتے ہیں اور کیا آپ کے پاس ''انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا'' پہلے سے موجود ہے؟ میں نے کہا جی ہاں لینا چاہتا ہوں اور پہلے سے بھی موجود ہے، اگر آپ کے پاس پہلے سے ''انسائیکلو پیڈیا'' موجود ہے تو آپ کو ہم یہ پچاس فی صد رعایت میں دے دیں گے یعنی جو اصل قیمت ہے اس کی آدھی قیمت پر دے دیں گے، میں نے کہا کہ میرے پاس ہے تو سہی، لیکن کوئی ثبوت نہیں جس سے ثابت کروں کہ میرے پاس ہے۔

دکاندار نے کہا کہ ثبوت چھوڑیں، بس آپ نے کہہ دیا کہ ''ہے'' تو بس آپ پچاس فی صد کے حقدار ہیں، اب میں نے حساب لگایا کہ پچاس فی صد رعایت کے ساتھ کتنے پیسے بنیں گے، تو پچاس فی صد رعایت کے ساتھ وہ تقریباً پاکستانی چالیس ہزار روپے بن رہے تھے، مجھے اپنے دارالعلوم کے لیے خریدنی تھی، دارالعلوم ہی کے لیے ''بریٹانیکا'' پہلے بھی موجود تھی۔

میں نے کہا کہ میں تو اب جا رہا ہوں یہ کتاب میرے پاس کیسے آئے گی؟ دکان دار نے کہا کہ آپ فارم بھر دیجیے، ہم یہ کتاب آپ کو جہاز سے بھیج دیں گے، جب میں نے وہ فارم بھر دیا تو دوکان دار کہنے لگا کہ آپ اپنا کریڈٹ کارڈ کا نمبر دے کر دستخط کردیجیے۔

تو میں ذرا ٹھٹکا کہ دستخط کروں یا نہ کروں اس لیے کہ دستخط کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ادائیگی ہوگئی وہ چاہے تو اسی وقت جا کر فوراً پیسے نکلوا سکتا ہے، مگر مجھے غیرت آئی کہ اس نے میری زبان پر اعتبار کیا اور میں یہ کہوں کہ نہیں میں نہیں کرتا، لہٰذا میں نے دستخط کر دیے، دستخط کرنے کے بعد میرے دل میں خیال آیا اور میں نے کہا کہ دیکھو یہاں آپ مجھے پچاس فی صد رعایت پر دے رہے ہیں، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، بلکہ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے یہاں سے کتابیں بہت رعایت سے خریدیں اور پاکستان جا کر مجھے اس سے بھی سستی مل گئیں، لوگ پتہ نہیں کس کس طرح منگوا لیتے ہیں اور سستی بیچ دیتے ہیں، تو مجھے اس بات کا احتمال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں مجھے اس سے سستی مل جائے! دکان دار نے کہا کہ اچھا کوئی بات نہیں، آپ جا کے پاکستان میں معلوم کر لیجیے، اگر آپ کو سستی مل رہی ہوگی تو ہمارا یہ آرڈر کینسل کر دیجیے گا اور اگر نہ ملے تو ہم آپ کو بھیج دیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیسے بتاؤں گا؟ تو دوکان دار کہنے لگا کہ آپ کو تحقیق کرنے میں کتنے دن لگیں گے، کیا آپ چار پانچ دن یعنی بدھ کے دن تک پتہ لگا سکیں گے؟ میں نے کہا ہاں! ان شاء اللہ۔ دکان دار نے کہا کہ میں بدھ کے دن بارہ بجے آپ کو فون کر کے پوچھوں گا کہ آپ کو سستی مل گئی کہ نہیں، اگر مل گئی ہو تو میں آرڈر کینسل کر دوں گا اور اگر نہیں ملی ہوگی تو پھر روانہ کر دوں گا۔ تو اس نے حجت ہی نہیں چھوڑی، لہٰذا میں نے کہا کہ اچھا بھائی ٹھیک ہے اور میں نے دستخط کر دیے اور فارم ان کو دے دیا، لیکن سارے راستے میرے دل میں دغدغہ لگا رہا کہ میں دستخط کر کے آگیا ہوں وہ اب چاہے تو اسی وقت جا کر بلا تاخیر چالیس ہزار روپے بینک سے وصول کر لے، اس میں تاخیر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا یہاں کراچی پہنچ کر میں نے دو کام کیے:

ایک کام یہ کیا کہ امریکن ایکسپریس میں جو کریڈٹ کارڈ کی کمپنی تھی اس کو خط لکھا کہ میں اس طرح دستخط کر کے آیا ہوں، لیکن اس کی پیمنٹ (ادائیگی) اس وقت تک نہ کریں جب تک میں دوبارہ آپ سے نہ کہوں۔

اور دوسرا کام یہ کیا کہ ایک آدمی کو بھیجا کہ یہ کتاب دیکھ کر آؤ، اگر مل جائے تو لے آؤ۔ میں پہلے یہاں تلاش کر رہا تھا، لیکن مجھے ملتی نہیں تھی، ایسا ہوا کہ اس نے جا کر تلاش کی تو صدر کی ایک دکان میں یہ کتاب مل گئی اور سستی مل گئی، یعنی وہاں چالیس ہزار روپے میں پڑ رہی تھی، یہاں تیس ہزار میں مل گئی، جبکہ وہ پچاس فی صد رعایت کرنے کے بعد تھی۔ اب میرا دل اور پریشان ہوا، اللہ کا کرنا کہ یہاں سستی مل رہی ہے اور اس نے کہا تھا کہ بدھ کے دن میں فون کروں گا خدا جانے فون کرے نہ کرے، لہٰذا میں نے احتیاطاً خط بھی لکھ دیا کہ بھائی یہاں مل گئی ہے، ٹھیک بدھ کا دن تھا اور بارہ بجے دوپہر کا وقت تھا اس کا فون آیا۔

دکان دار نے فون پر کہا کہ بتائیے آپ نے کتاب دیکھ لی، معلومات کرلیں؟ میں نے کہا جی ہاں کر لی ہے اور مجھے یہاں سستی مل گئی ہے، تو وہ کہنے لگا کہ آپ کو سستی مل گئی، میں آپ کا آرڈر کینسل کر دوں؟ میں نے کہا جی ہاں! اس پر دکان دار نے کہا کہ میں آرڈر کینسل کر رہا ہوں اور آپ نے جو فارم پُر کیا تھا اس کو پھاڑ رہا ہوں، اچھا ہوا کہ آپ کو سستی مل گئی، ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

چار پانچ دن بعد اس کا خط آیا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ کتاب آپ کو کم قیمت پر مل گئی، لیکن افسوس ضرور ہے کہ ہمیں آپ کی خدمت کا موقع نہیں مل سکا، لیکن وہ کتاب آپ کو مل گئی آپ کا مقصد حاصل ہوگیا آپ کو

مبارکباد دیتے ہیں اور اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ ہمارے ساتھ رابطہ قائم رکھیں گے۔

ایک پیسے کا اس کو فائدہ نہیں، فون لندن سے کراچی اپنے خرچ پر کیا پھر خط بھی بھیج رہا ہے!

یہاں ہم ان کو گالیاں والیاں بہت دیتے ہیں جب کہ ان میں سے بیشتر افراد ان اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ہم چھوڑ چکے ہیں، بہرحال کفر کی وجہ سے ان سے نفرت ہونی بھی چاہیے، لیکن انہوں نے بعض وہ اعمال اپنا لیے ہیں جو درحقیقت ہمارے اپنے اسلامی تعلیمات کے اعمال تھے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو فروغ دیا۔

حق میں سرنگوں اور باطل میں ابھرنے کی صلاحیت نہیں ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) ایک بڑی یاد رکھنے کی اور بڑی زریں بات فرمایا کرتے تھے کہ باطل کے اندر تو ابھرنے کی صلاحیت نہیں ہے "إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا"، لیکن اگر کبھی دیکھو کہ کوئی باطل پرست ابھر رہے ہیں تو سمجھو کوئی حق والی چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس کو ابھار دیا ہے، کیونکہ باطل میں تو ابھرنے کی طاقت تھی ہی نہیں، حق چیز لگ گئی اس نے ابھار دیا۔

اور حق میں صلاحیت سرنگوں ہونے کی نہیں "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ"، تو جب حق اور باطل کا مقابلہ ہو تو ہمیشہ حق کو غالب ہونا ہے، اس میں صلاحیت نیچے جانے کی نہیں ہے۔ اگر کبھی دیکھو کہ حق والی قوم نیچے جارہی

ہے تو سمجھ لو کہ کوئی باطل چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس کو گرایا ہے، یہ بڑی کانٹے کی بات ہے۔

ہمارے ساتھ ان کے یہ سب باطل لگ گئے اور ان اقوام نے ان حق باتوں کو اپنا لیا ہے، تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے کم از کم دنیا میں تو اس کا بدلہ ان کو دیا کہ دنیا کے اندر ان کو فروغ حاصل ہوا، ترقی ملی، عزت ملی، لیکن آخرت میں معاملہ تو اور ہی معیار پر ہونا ہے، یعنی وہاں کا معاملہ دوسرے معیار کا ہے لہٰذا وہاں کا معاملہ تو وہاں ہوگا، لیکن دنیا کے اندر ان کو جو ترقی مل رہی ہے اور ہم جو نیچے گر رہے ہیں اس کے اسباب یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا دار الاسباب بنائی، انہوں نے یہ اخلاق اختیار کیے تو ان اخلاق کے اختیار کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے تجارت کو فروغ دیا، صنعت کو فروغ دیا اور سیاست میں فروغ دیا اور تم نے یہ چیزیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات چھوڑ دیے، لہٰذا اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں ہماری پٹائی کرادیتے ہیں، روز پٹائی ہورہی ہے۔

برطانیہ میں ایک بے روزگاری الاؤنس ہوتا ہے، یعنی کوئی آدمی بے روزگار ہوگیا اور حکومت کو پتہ چل گیا کہ یہ بے روزگار ہے تو اس کا ایک الاؤنس جاری کردیتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ بے روزگار ہے تو بھوکا نہ مرے، بلکہ اس کو ایک وظیفہ ملتا رہے اور اگر معذور نہیں ہے تو روزگار کی تلاش میں لگا رہے کوشش کرتا رہے اور جب روزگار مل جائے تو اپنا روزگار خود سنبھالے اور اگر معذور ہے تو وظیفہ ملتا رہتا ہے۔

اب ہمارے مسلمان بھائیوں کی ایک بڑی تعداد وہاں پر ہے، اس نے اپنے آپ کو بے روزگار ظاہر کر کے وہ ایک الاؤنس جاری کروا رکھا ہے اور بہت

سے ایسے ہیں جو کہتے ہیں جب آرام سے گھر پر مل رہا ہے تو کمانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ جن کو روزگار ملا ہوا ہے، یعنی چوری چھپے روزگار بھی کر رہے ہیں اور وہ الاؤنس بھی لے رہے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ائمہ مساجد یہ کام کر رہے ہیں اور اس کی دلیل یہ بنا لی ہے کہ یہ تو کافر لوگ ہیں ان سے پیسے وصول کرنا ثواب ہے، لہٰذا ہم یہ پیسے وصول کریں گے، امامت کے پیسے بھی مل رہے ہیں اور ٹیوشن بھی چلا رہے ہیں اور بے روزگاری الاؤنس بھی لے رہے ہیں۔

ہم اس عذاب میں مبتلا ہیں تو پھر رحمت کیسے نازل ہو؟ اور جب ہمارا یہ حال ہوگیا تو کیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت شاملِ حال ہو؟

معاشرے کی اصلاح فرد سے ہوتی ہے

کسی معاشرے کی اصلاح افراد سے ہوتی ہے، یہ سوچنا کہ چونکہ سب یہ کر رہے ہیں تو میں اکیلا کر کے کیا کروں گا؟ یہ شیطان کا دوسرا دھوکہ ہے، دوسرے خواہ کچھ کر رہے ہوں ''لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ'' اپنے طور پر اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ سے درست کرلو اور جو اخلاق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں ان کے اوپر عمل کرلو تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب ایک چراغ جلتا ہے تو اس ایک سے دوسرا چراغ جلتا ہے اور جلے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تجارت کے ناجائز معاملات احادیث کی روشنی میں

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجارت کے ناجائز معاملات احادیث مبارکہ کی روشنی میں

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس معاملے پر گواہ بننے والوں پر لعنت کی اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں''۔ (۱)

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آجائے گا کہ کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جس نے سود نہ کھایا ہو اور اگر سود نہ کھایا ہوگا تو اس کا غبار اسے ضرور پہنچے گا''۔ (۲)

---

(۱) صحیح مسلم ۳/۱۲۱۸ (۱۵۹۷)۔

(۲) سنن ابی داود ۳/۲۴۳ (۳۳۳۱) وسنن ابن ماجه ۳/۵۹۸ (۲۲۷۸) ومسند احمد ۱۶/۲۵۸ (۱۰۴۱۰) وقال المنذری "الترغيب والترهيب" (۳/ ۸): رواه أبو داود وابن ماجه، كلاهما من رواية الحسن عن أبي هريرة واختلف في سماعه، والجمهور على أنه لم يسمع منه.

③ حضرت عبد اللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اگر کوئی شخص جان بوجھ کر سود کا ایک درہم کھا لے تو یہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے''۔ (۱)

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سود (کا گناہ) ستر اجزاء پر مشتمل ہے۔ ان میں سے خفیف ترین ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے''۔ (۲)

⑤ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں نے آج رات خواب میں دیکھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھ کو ایک مقدس سرزمین کی طرف لے چلے، یہاں تک کہ ہم ایک خون کی نہر پر پہنچے، اس کے درمیان میں ایک شخص کھڑا تھا اور دیکھا کہ نہر کے کنارے کی طرف آتا ہے اور جب نکلنا چاہتا ہے تو کنارے والا شخص اس کے

---

(۱) مسند احمد ۲۸۸/۳٦ (۲۱۹۵۷) وقال المنذری فی ''الترغیب والترهیب'' (۵/۳): رواه أحمد والطبراني في الكبير، ورجال أحمد رجال الصحيح.

(۲) سنن ابن ماجه ۵۹٦/۳ (۲۲۷٤) وقال المنذری فی ''الترغیب والترهیب'' (٦/۳): رواه ابن ماجه والبيهقي كلاهما عن أبي معشر، وقد وثق.

منہ پر ایک پتھر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پھر اسی جگہ جا پہنچتا ہے، پھر جب کبھی نکلنا چاہتا ہے اسی طرح اس کے منہ پر پتھر مار مار کر اس کو اپنی پہلی جگہ لوٹا دیتا ہے، میں نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس کو میں نے نہر میں دیکھا؟ تو میرے ساتھی نے کہا یہ سود کھانے والا ہے''۔(۱)

⑥ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص بھی سود کے ذریعے زیادہ مال کمائے گا انجام کار اس کو قلت کا سامنا کرنا پڑے گا''۔(۲)

⑦ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص کوئی غلہ خریدے تو جب تک وہ غلہ اپنے قبضہ میں نہ آئے اس وقت تک اسے آگے ہرگز فروخت نہ کرے''۔(۳)

⑧ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری ۵۹/۳(۲۰۸۵)۔
(۲) سنن ابن ماجہ ۵۹۹/۳(۲۲۷۹) وقال المنذری فی ''الترغیب والترھیب''(۸/۳): رواہ ابن ماجہ والحاکم، وقال صحیح الإسناد.
(۳) صحیح البخاری ۶۷/۳(۲۱۳۶) وصحیح مسلم ۱۱۶۰/۳(۱۵۲۶)۔

''کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے (یعنی اگر دو آدمیوں میں کوئی خرید وفروخت کا معاملہ ہورہا ہو اور وہ بیع پر آمادہ ہونے لگے ہوں تو ان کے بیچ میں جاکر اسی سامان کا اپنے لیے کوئی معاملہ نہ کرے) اور نہ کوئی شخص اپنے بھائی کے منگنی کے پیغام پر اپنا پیغام دے''۔(۱)

⑨ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے، لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو کہ اللہ ان میں سے ایک کو دسرے کے ذریعے رزق دیتا ہے''۔(۲)

(۱) صحیح مسلم ۱۰۳۲/۳(۱۴۱۲)۔
(۲) صحیح مسلم ۱۱۵۷/۳(۱۵۲۲)۔
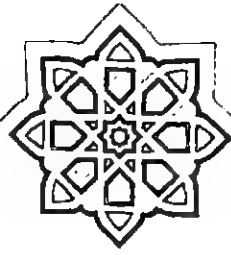
تدبیر اور روزگار

(اسلام اور ہماری زندگی ۳/۳۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تدبیر اور روزگار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”کان صلی اللہ علیہ وسلم یعزل نفقة أھلہ سنة“(۱)

(۱) ماخوذ از صحیح البخاری ۶۳/۷ (۵۳۵۷) وصحیح مسلم ۱۳۷۷/۲ (۱۷۵۷)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہل وعیال کا ایک سال کا نفقہ جدا کر کے الگ رکھ لیا کرتے تھے کہ یہ سال بھر اہل وعیال کے نفقے میں خرچ کیا جائے گا۔

یہ عادت بیان فرمائی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کہ تمام ازواج مطہرات کا سال بھر کا نفقہ ان کے گھروں میں پہنچا دیا جاتا تھا اور خود آپ کا نفقہ بھی اس میں شامل ہوتا تھا، البتہ وہ ازواج مطہرات بھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات تھیں، سال بھر کا نفقہ یا خرچہ پہنچ تو جاتا تھا، لیکن صدقہ خیرات کثرت سے کرنے کا معمول تھا، اس لیے ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں بعض اوقات تین تین مہینوں تک آگ نہیں جلتی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاشی زندگی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہم تین متواتر چاند دیکھتے تھے اور اس پورے عرصے میں گھر کے اندر آگ نہیں جلی ہوتی تھی، جن صاحب سے یہ بیان فرما رہی تھی انہوں نے پوچھا کہ پھر آپ کا گزارہ کس چیز پر ہوتا تھا؟ تو آپ نے فرمایا:

”الأسودان: التمر والماء“(۱)

”دو ہی چیزوں پر گزارا ہوتا تھا، ایک کھجور ایک پانی“

لیکن تین تین مہینے تک آگ نہیں جلتی تھی، یہ بھی واقعات پیش آئے، یہ

(۱) صحیح البخاری ۱۵۳/۳ (۲۵۶۷) وصحیح مسلم ۲۲۸۳/٤ (۲۹۷۲)۔

واقعات بھی پیش آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیٹ پر پتھر باندھے[1]، یہ واقعات بھی پیش آئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور کبھی گندم تناول نہیں فرمایا، آپ کا کھانا جو کی روٹی کا ہوتا تھا۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کبھی کھانے کی چوکی نہیں بچھائی گئی، کبھی آپ کے لیے چپاتی نہیں بنائی گئی۔[3]

چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں جو چٹنی اچار وغیرہ ہوتے ہیں جو بھوک بڑھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں وہ ساری عمر نہیں ہوئے، یہ سارے واقعات پیش آئے اس کے باوجود یہ فرمایا جارہا ہے کہ سارے سال کا نفقہ اٹھا کر ایک طرف کر لیا جاتا تھا، وہ اس وجہ سے کہ نفقہ تو سال بھر کا اکٹھا ہوگیا، لیکن صدقہ خیرات کرنے کا معمول کثرت سے تھا، خود آپ کا بھی اور آپ کی ازواجِ مطہرات کا بھی، اس کی وجہ سے یہ حالات پیش آتے تھے، تو اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مختلف اور متضاد پہلوؤں کو اپنی سنت قرار دے دیا۔

ضروریات کا اہتمام توکل کے منافی نہیں

ایک طرف یہ تعلیم دے دی اپنے عمل سے کہ سال بھر کا خرچہ اکٹھا کر لینا یہ کوئی شریعت کے خلاف یا توکل کے خلاف نہیں ہے، یہ سمجھنا کہ سال بھر کا

---

(۱) صحیح مسلم ۱۶۱٤/۳ (۲۰٤۰)۔
(۲) صحیح البخاری ۷۵/۷ (۵٤۱٦) و صحیح مسلم ۲۲۸۳/٤ (۲۹۷٤)۔
(۳) صحیح البخاری ۷۵/۷ (۵٤۱۵) و ۹٦/۸ (٦٤۵۰)۔

خرچہ اکٹھا جمع کر لیں گے تو یہ توکل کے خلاف ہو جائے گا، اللہ پر بھروسہ نہیں رہے گا یہ بات صحیح نہیں، اگر انسان سال بھر کا خرچہ اکٹھا کر لے تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ کسی مصلحت سے بقدرِ ضرورت ذخیرہ رکھ لینا نہ توکل کے منافی ہے اور نہ کمالِ توکل کے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اکمل ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ اگر یہ کمالِ توکل کے خلاف ہوتا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ کبھی نہ کرتے، آپ سے زیادہ کامل توکل رکھنے والا کون ہوگا، تو اس واسطے نہ توکل کے خلاف ہے نہ کمالِ توکل کے خلاف ہے اور وہ مصلحت عام ہے خواہ عیال کی مصلحت ہو خواہ نفس کی مصلحت ہو، اس کے لیے اگر ذخیرہ کر کے رکھ لیا سال بھر کا تو یہ کوئی توکل کے خلاف نہیں۔

توکل کی اصل حقیقت

توکل درحقیقت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ پر بھروسہ ہو اگرچہ میں اسباب اختیار کر رہا ہوں، اس واسطے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسباب بنایا ہے، اس لیے اسباب اختیار کر رہا ہوں، لیکن اسباب میں کچھ نہیں رکھا، بلکہ یہ اسباب اس وقت تک کارآمد نہیں جب تک مسبب یعنی اللہ تعالیٰ اس میں تاثیر پیدا نہ کریں، سال بھر کا نفقہ اٹھا کر رکھ لیا پھر بھی بھروسہ اس سال بھر کے جمع شدہ اندوختے پر نہیں بھروسہ اللہ ہی پر ہے، اپنی طرف سے جو تدبیر تھی، وہ کر لی سال بھر کا اکٹھا کر لیا، لیکن کچھ بھروسہ نہیں، سال بھر میں یہ کہیں ضائع ہو جائے، ہلاک ہو جائے، کیڑا لگ جائے، نقصان ہو جائے، چوری ہو جائے، ڈاکہ پڑ جائے، ہزار احتمال ہیں، تو اپنی طرف سے تدبیر کر لی، لیکن بھروسہ اللہ پر ہے

کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رزق دینے والا ہے وہی کفالت کرنے والا ہے، تو اسباب کو اختیار کرنے کے ساتھ صرف اللہ پر بھروسہ رکھا جائے۔

انسانی مزاج کا فرق

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات دین کے اندر یہ بھی مطلوب ہے کہ انسان کے دل کو اطمینان حاصل ہو اور جمعیتِ خاطر ہو، تشویش نہ ہو اور پریشانی نہ ہو، لہٰذا طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی، جمع ہے کہ نہیں ہے، ذخیرہ ہے کہ نہیں ہے، ان کے روزمرہ کے معمولات میں کام میں کوئی فرق نہیں آتا اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو ضرورت ہوتی ہے اس بات کی کہ جب تک ظاہری اسباب نظر نہ آجائیں اس وقت تک پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا، جمعیتِ خاطر نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا انوکھا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس سرہ سے سنا کہ ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ وہ ایک دن بیٹھے ہوئے دعا کر رہے تھے:

"یا اللہ مجھے تو آپ سال بھر کا خرچہ اکٹھا ایک مرتبہ دے دیجئے"

یہ دعا وہ بہت گڑگڑا کر مانگ رہے تھے، وہ بزرگ انتہائی صاحبِ کشف وکرامات تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی وقت الہام ہوا کہ کیا تمہیں ہمارے اوپر بھروسہ نہیں جو سال بھر کا اکٹھا مانگ رہے ہو؟ آج کا مانگو کل کا کل کو دیکھا جائے گا۔

جواب میں کہنے لگے کہ یا اللہ بھروسہ تو ہے آپ کی ذات پر، لیکن یہ کم بخت شیطان ہر وقت مجھے بہکاتا رہتا ہے کہ کل کو کیا کھائے گا؟ پرسوں کو کیا کھائے گا؟ اور اولاد کو کیا کھلائے گا؟ یہ دل میں تشویش پیدا کرتا رہتا ہے، پریشانی پیدا کرتا رہتا ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ یہ تشویش رفع ہوجائے، جب وہ دل میں یہ بات ڈالے گا کہ کل کو کیا کھلائے گا تو اشارہ کروں گا دیکھ یہ رکھا ہے، تو جب اشارہ کردوں گا تو اب اس کے بعد تشویش کرنے کی عقوبت ختم ہوجائے گی، اس واسطے اکٹھے مانگ رہا ہوں۔

ان کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور انہیں سال بھر کا نفقہ عطا فرمادیا۔

چونکہ نیت درست تھی، نیت یہ کہ جمعیتِ خاطر ہو اور دل مطمئن رہے، جب انسان کو اطمینان ہوجائے تو اس کو اپنے کام کے اندر شرحِ صدر بھی حاصل ہوتا ہے، تقویت بھی ہوتی ہے، جمعیتِ خاطر بھی ہوتی ہے اور یہ جمعیتِ خاطر اس طریق میں بڑی نعمت ہے، دل کا پرسکون رہنا تشویش سے محفوظ رہنا یہ اس طریق میں بڑی نعمت ہے، اس لیے کہ اس طریق کا حاصل ہے اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہوجانا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد کا دل میں بس جانا کہ ہر وقت دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے، یہ ہے جمعیتِ خاطر اور یہ جو تشویشات آرہی ہیں یہ ہم جیسے کمزور لوگوں کی جمعیتِ خاطر کو خراب کرتی ہیں، پھر عبادت میں بھی آدمی کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا، ذکر میں بھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا، جبکہ طریق کا حاصل اور مقصد ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ دل کا جڑ جانا کہ جب خاموش بیٹھا ہے انسان تنہائی میں بیٹھا ہے اس وقت بھی دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے، قلب ذکر میں مشغول ہے، کیونکہ ایک حدیث ہے

جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''شیطان انسان کے قلب کی تاک میں رہتا ہے''(۱)

جب بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو یاد کر رہا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوتا ہے اللہ کی طرف دھیان ہوتا ہے تو یہ شیطان بھاگ جاتا ہے اور جب غفلت میں ہوتا ہے تو غفلت کی حالت میں وسوسے ڈالتا ہے۔

انسانی دل کی دو حالتیں

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا یا تو اس کا دل مشغول ہوگا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں یا مشغول ہوگا شیطانی وساوس میں تیسرا حال نہیں، اگر اللہ کے ذکر میں مشغول نہیں ہے تو شیطان طرح طرح کے وسوسے دل میں ڈالتا رہے گا، لہٰذا شیطانی وساوس سے بچنے کا راستہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر اور ذکر یہ عام ہے چاہے زبان سے ہو، چاہے دل سے ہو، چاہے تسبیح کی شکل میں ہو، چاہے نماز کی شکل میں ہو، چاہے صدقہ خیرات کی شکل میں ہو، چاہے کسی اور اطاعت کی شکل میں ہو، جو بھی اطاعت کا کام انسان کر رہا ہے وہ ذکر کے اندر داخل ہے۔

ہر اطاعت ذکر اللہ کے مترادف ہے

علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ حصن حصین میں فرماتے ہیں:

(۱) صحیح البخاری ۱/۱۲۵ (۶۰۸) وصحیح مسلم ۱/۲۹۱ (۳۸۹)۔

"کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر"

"جو بھی اللہ کی اطاعت کا کام کر رہا ہو وہ ذاکر ہے"۔

یعنی جو بھی اطاعت کا کام کر رہا ہے ذکر کرنے والے میں داخل ہے، یہاں تک کہ کسبِ رزق میں مشغول ہے، لیکن صحیح نیت کے ساتھ ہے کہ اپنے حق کو ادا کرنا مقصود ہے اور صحیح طریقے کے ساتھ ہے کہ حلال طریقے سے حاصل کرنا مقصود ہے حرام سے بچنا مقصود ہے تو وہ بھی ذکر کا ایک فرد ہے۔

پس جتنی بھی طاعات ہیں وہ ساری کی ساری ذکر کا فرد ہیں یا تو انسان اس میں مشغول رہے گا یا پھر اگر اس میں مشغول نہیں رہتا اپنے قلب کو اس میں مشغول نہیں کرتا تو پھر شیطانی وساوس کا شکار ہوگا، اسی لیے کہتے ہیں کہ دل کو اللہ کے لیے فارغ رکھو۔

دل کو اللہ کے لیے فارغ کیجیے!

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سنا رہے تھے کہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خانقاہ سے گھر کی طرف جا رہا تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب خانقاہ سے گھر کی طرف تشریف لے جاتے تھے تو عوام کو یہ ہدایت تھی کہ کوئی آدمی ساتھ نہ چلے، ساتھ چلنا منع تھا، اس واسطے کہ یہ جو پیروں کی ہیئت ہوتی ہے کہ پیر صاحب جا رہے ہیں تو ایک خلقت دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے ان کے ساتھ چل رہی ہے، اس ادا کو حضرت پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے عام طور سے ممانعت تھی کہ جب میں اٹھ کر جاؤں جتنی بات کرنی ہے پہلے کر لو، پھر جب میں جانے لگوں تو میرے ساتھ دائیں بائیں نہ چلو، مجھے تنہا جانے دو اور یہ بھی ہدایت

تھی کہ کوئی میرا سامان نہ اٹھائے جو میں لے کر جا رہا ہوں، جو سامان میرے ہاتھ میں ہے میں خود لے کر جاؤں گا کوئی آدمی آگے بڑھ کر اس کو نہ اٹھائے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت فرماتے تھے کہ بھائی میں تو خادم ہوں، مخدومیت سے مجھے کیا کام؟ میں تو خادم ہو اس واسطے یہ بات کہ کچھ مریدین آگے چل رہے ہیں، کچھ پیچھے چل رہے ہیں، کچھ دائیں چل رہے ہیں، کچھ بائیں چل رہے ہیں، کوئی سامان اٹھا رہا ہے۔ یہ بات حضرت کو پسند نہیں تھی۔ بس عام آدمی جس طرح جاتے ہیں اس طریقے سے جایا کرتے تھے، لیکن کبھی حضرت کے کچھ خاص مزاج شناس خدام کسی ضرورت کی وجہ سے ساتھ ہو جائیں تو ایسے موقع پر منع بھی نہیں فرماتے تھے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق تھا تو فرمانے لگے کہ میں ایک دن حضرت کے ساتھ خانقاہ سے گھر کی طرف چلا، چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ اچانک حضرت نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور لکھ کر پھر جیب میں ڈال لیا، پھر فرمانے لگے ''تم نے دیکھا مولوی شفیع میں نے یہ کیا کیا؟''

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا ''حضرت بیان فرمادیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی''۔

اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''مجھے ایک کام یاد آیا کہ وہ کام کرنا ہے تو اس کا دل پر بوجھ تھا، میں نے وہ کاغذ پر لکھ لیا، دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر دیا، اب الحمد للہ دل فارغ ہے، یہ دل تو حقیقت میں ایک ہی چیز کے لیے ہے اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر۔ جب کوئی

تشویش آئے اور کئی بوجھ آئے تو حتی الامکان اس تشویش اور بوجھ کو جلدی سے ختم کرنے کی کوشش کرو تاکہ دل فارغ ہوجائے اس ذات کے لیے جس ذات کے لیے یہ بنایا گیا ہے''۔

دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے

یہ دل تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی گاہ ہے، لہٰذا ہونا یہ چاہیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر ہو، تو دل کو فارغ کر لیا دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر کے اور پھر فرمایا کہ بس کوشش یہ کرو کہ دل میں اِدھر اُدھر کی جو تشویشات ہیں وہ نہ ہوں، بس وہ ایک کام میں مشغول رہے جس کام کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے تو یہ ہے جمعیتِ خاطر کا حصول!

میں نے اپنے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے سنا (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) حضرت مرض الوفات میں بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں بند کی ہوئی ہیں، معالجین نے لوگوں سے ملاقات منع کر رکھی ہے کہ کوئی ملاقات نہ کرے، بیماری کی اس حالت میں کوئی آتا اور کہتا کہ حضرت فلاں دوا کا وقت ہوگیا ہے دوا پی لیجیے، خیر دوا پی لی، کوئی اور آ گیا ان سے طبیعت پوچھ لی کہ حضرت کیسے مزاج ہیں؟ اس طرح مختلف لوگ آ آ کر باتیں کرتے رہتے، ایک دن مولانا شبیر علی صاحب جو حضرت کی خانقاہ کے ناظم تھے ان سے فرمایا:

''بھائی مولوی شبیر علی صاحب جو ضرورت کی بات ہو وہ پوچھ لیا کرو، باقی اور زیادہ آ کر سوالات کرنے سے کچھ حاصل نہیں

اور کیوں ایک مشغول آدمی کو پریشان کر رہے ہو“۔

مطلب یہ کہ دل تو لگا ہوا ہے کسی اور طرف اور اس وقت میں آکر آپ باتیں کر رہے ہو مختلف قسم کے مسائل میرے سامنے چھیڑ دیتے ہو، اس سے دل کسی اور طرف منتقل ہو جاتا ہے تو مشغول آدمی کو کیوں پریشان کرتے ہو۔

اصل یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہے، ورنہ پھر وہ شیطانی وساوس کا محل بن جاتا ہے، اس لیے جمعیتِ خاطر اس طریق میں مطلوب ہے اور جس شخص کو جمعیتِ خاطر اسباب کے حصول کے بغیر حاصل نہ ہو اس کو چاہیے کہ اسباب حاصل کرے، تاکہ اطمینان ہو، تکلیف رفع ہو اور جمعیتِ خاطر حاصل ہو اور ان اسباب کو یہ سمجھنا کہ توکل کے منافی ہو گئے یہ بالکل غلط بات ہے، یہ توکل کے منافی نہیں، اس لیے کہ اسباب کو درجہ اسباب میں اختیار کیا جا رہا ہے حقیقی بھروسہ اللہ پر ہے، کہ ان اسباب میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ پیدا نہ کریں۔

حصولِ رزق کی فکر ممنوع نہیں

رزق کے حاصل کرنے کی فکر اور رزقِ حلال حاصل کرنے کی فکر میں چاہے وہ ذخیرہ کرنے کی ہی شکل میں ہو تو یہ نہ ممنوع بات ہے، نہ مکروہ ہے، نہ بری بات ہے اور نہ توکل اور تقویٰ کے منافی ہے، بلکہ جمعیتِ خاطر کے حصول کے لیے ایسا کرنا اور زیادہ بہتر ہے، لیکن جو چیز بری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اس کے اندر اتنا منہمک ہو جائے کہ لگا تو تھا اس کام کے لیے کہ اپنے دل کو فارغ کرے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کے لیے اور اپنے اسباب کو تدبیر کے درجے میں اختیار

کرلے اور باقی وقت اللہ تعالیٰ کے کام میں لگائے، لیکن جب لگا تو اتنا منہمک ہوا کہ صبح سے لے کر شام تک، شام سے لے کر صبح تک اور کوئی خیال آتا ہی نہیں، سوائے اس کے کہ پیسے سے پیسہ کس طرح بناؤں اور دولت میں کیسے اضافہ کروں اسبابِ راحت مزید سے مزید جمع کروں، دن رات اسی میں لگا ہوا ہے، یہ انہماک توکل کے خلاف ہے، یہ انہماک ہے، بری بات ہے، لیکن بقدرِ ضرورت اور ضرورت میں راحت بھی داخل ہے، یہ بھی سمجھ لیں، یعنی ضرورت تو اس طرح بھی پوری ہوسکتی ہے کہ آدمی سال بھر کا اتنا نفقہ جمع کرلے جس میں دال روٹی سال بھر کی ہوجائے، خشک چاول اور دال کا حساب کرکے انسان جب جمع کرے تو ضرورت ویسے ہی پوری ہوجاتی ہے، لیکن اتنا بھی شریعت نے کوئی ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ اپنی راحت کے حساب سے جتنا اس کو مطلوب ہے اتنا اگر جمع کرلے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ ایک دن فرمانے لگے:

> ''دیکھو بھائی ہر شخص کی ضرورت اور ہر شخص کی حاجت اور راحت مختلف ہوتی ہے۔ ایک آدمی ہے وہ بیچارہ اکیلا رہتا ہے تو اس کے لیے تھوڑی چیز کافی ہوجائے گی اور تھوڑی چیز سے اس کی ضرورت رفع ہوجائے گی، لیکن اس واسطے فقہاءِ کرام نے فرمایا کہ حاجاتِ اصلیہ میں یہ ہے کہ تین جوڑے ہوں، سال بھر کا راشن ہو تو حاجاتِ اصلیہ پوری ہوجاتی ہیں اور ایک پیالہ یا پلیٹ ہو تو برتن کی ضرورت

پوری ہوگئی، لیکن ایک شخص ہے کہ جس کے پاس مہمان آتے ہیں تو اس کی حاجات پہلے شخص کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں، اس واسطے وہ اگر اپنی حاجت کے مطابق جمع کر رہا ہے، اپنی حاجت کے مطابق تدبیر کر رہا ہے تو اس میں شریعت کے خلاف بات نہیں''۔

میں نے ایک مرحلے پر حضرت کو لکھا کہ میری اتنی آمدنی ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ مدرسے سے تنخواہ لینا بند کردوں، وہ اس واسطے کے دوسرے ذریعہ سے جو آمدنی ہے وہ ضرورت کے مطابق پوری ہوجاتی ہے تو حضرت نے اس کے اوپر لکیر کھینچ کر لکھا کہ یہ آپ کی ضرورت کو پورا کرنے والی مقدار نہیں، لہٰذا لیں البتہ جو بچ جائے اس کو مدرسے میں اپنی طرف سے داخل کردیں۔

حصولِ روزگار میں افراط سے بچنا ضروری ہے

بات یہ چل رہی تھی کہ اپنی ضرورت کے مطابق ہر انسان جو کچھ جمع کرے وہ شریعت میں ناپسندیدہ بھی نہیں مکروہ بھی نہیں تصوف کے بھی خلاف نہیں، طریقت کے بھی خلاف نہیں، تقویٰ کے بھی خلاف نہیں۔

لیکن تقویٰ کے خلاف اور طریقت کے خلاف بات یہ ہے کہ دن رات ذہن پر بس اسی کی چکی چل رہی ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے، سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح میری دولت میں اضافہ ہوجائے، کس طرح سے میرا ایک کارخانہ ہے تو دو لگ جائیں اور دو ہیں تو تین ہوجائیں اور کس طرح میرے بینک بیلنس میں اضافہ ہوجائے اور کس طرح مجھے تعیّشات حاصل ہوجائیں دن

رات اسی فکر میں لگا ہوا ہے، یہ ہے بری بات، اس سے بچنے کی ضرورت ہے، اب یہ کہ کس طرح بچیں؟ کس طرح حد فاصل قائم کریں؟ کہ کہاں ضرورت کی حد ختم ہوگئی اور کہاں تعیشات کی حد شروع ہوگئی، تو وہی بات ہے جو آپ سے بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ دو اور دو چار کر کے اس کا کوئی فارمولا نہیں بتایا جاسکتا، یہ چیز تو محض صحبت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، کسی کامل شیخ کی رہنمائی سے پتہ چلتا ہے کہ اب آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں، اپنے آپ کو دن رات ہر وقت اسی فکر میں لگائے رکھنا، اس سے پناہ مانگی گئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا(۱)

اے اللہ! دنیا کو ہمارا بڑا غم نہ بنا، سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنا اور نہ ہی اسے ہماری رغبت کی انتہا بنا۔

یا اللہ! ایسا نہ ہو کہ دنیا ہی کا خیال ہمارے تمام خیالات پر غالب آجائے، سب سے بڑی فکر سب سے بڑی دھن یہ دنیا بن جائے کہ دنیا کس طرح حاصل ہو اور پیسے کہاں سے حاصل ہوں اور نہ ایسا ہو کہ ساری معلومات جو ہیں وہ دنیا کے اندر محدود ہو کر رہ گئی ہیں اور ہماری پسند، ہماری رغبت اور ہمارے شوق کا مرکز دنیا ہی بن جائے، ہر وقت اسی کے خیال آرہے ہیں، ہر وقت اسی کی فکر میں پڑا ہوا ہے، یہ ہے بری بات اور اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی ۴۸۱/۵ (۳۵۰۲) وقال هذا حديث حسن غريب وامالي الشجرى ۳۱۵/۱ (۱۰۹۹) طبع دار الكتب العلمية۔ بيروت۔

اسلام کی معتدل تعلیم

آپ دیکھیں کیسی معتدل تعلیم ہے کہ ہماری ضرورت کو کہیں روکا نہیں اور ضرورت ہی نہیں، بلکہ راحت کو بھی نہیں روکا، لیکن ساتھ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کو آگے بڑھا کر اپنے اوپر مسلط مت ہونے دو، تدبیر اس لیے کرو تا کہ ذہن فارغ ہوجائے، دل فارغ ہوجائے اللہ کے لیے فارغ ہوجائے۔ الحمد للہ سال بھر کا اکٹھا کر لیا اب چلو اپنے کام میں متوجہ ہوجاؤ، اللہ کی طرف متوجہ ہوجاؤ، یہ ہے مقصود، تو اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے، جمعیتِ خاطر کو پیدا کرنے کے لیے جتنی تدبیر کرنی ہے وہ کرلے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتیں کر کے دکھا دی، ایک طرف سال بھر کا نفقہ جمع کر کے دے دیا تا کہ پتہ چل جائے کہ یہ صورت جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں اور دوسری طرف اتنی خیرات کی اتنی خیرات کی کہ تین مہینے تک گھر میں آگ نہیں جل رہی ہے، دونوں باتیں کر کے دکھا دیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زہد

فرشتہ آتا ہے آکر کہتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اس احد پہاڑ کو سونے کے پہاڑ میں تبدیل کردیں سارا سونے کا بنادیں، یہ پیشکش ہوتی ہے فرشتے کی طرف سے، تو جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ’’نہیں مجھے تو یہ پسند ہے کہ ایک دن بھوکا رہوں ایک دن کھاؤں‘‘۔ (۱)

(۱) سنن الترمذی ۱۶۸/۴ (۲۳۴۷) وقال ھذا حدیث حسن۔

اگر نبی کریم ﷺ یہ عمل نہ فرماتے تو یہ غریب فاقہ کش کہاں جاتے، ان غریب فاقہ کشوں کے لیے نبی کریم ﷺ نے خود عمل کر کے، پیٹ پر پتھر باندھ کر، مشکلیں سہہ کر، پریشانیاں اٹھا کر اور اس کے واسطے تسلی کا سامان کر دیا کہ اے غریبو! تم جن حالات سے گزر رہے ہو، گھبراؤ نہیں، محمد ﷺ کے اوپر بھی یہ حالات گزر چکے ہیں، تم اگر غیر اختیاری طور پر ان حالات سے گزر رہے ہو تو آپ ﷺ اختیاری طور پر ان حالات سے گزرے، ان کے لیے تسلی کا سامان پیدا فرما دیا نبی کریم ﷺ نے، ہم جیسے کمزوروں کے لیے تسلی کا یہ سامان پیدا فرما دیا کہ سال بھر کا نفقہ اکٹھا جمع کر کے اپنا اسوہ بتا دیا کہ یہ بھی میری سنت ہے، ہم جیسے کمزوروں کے لیے یہ بتا دیا اور دوسرے لوگوں کے لیے جو فاقے میں مبتلا ہوں ان کے لیے سنت یہ بتا دی کہ دیکھو میری سنت یہ ہے کہ تین مہینے تک میرے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔

قربان جائیں نبی کریم ﷺ کی ایک ایک ادا پر کہ آپ ﷺ نے امت کے کسی طبقے کو اپنی سنت سے اپنے اسوہ سے محروم نہیں فرمایا، ایک مرتبہ ایک جبہ زیب تن فرمایا تو دس ہزار دینار تقریباً اس کی قیمت تھی[1]، اتنی قیمت کا جبہ بھی زیب تن فرمایا اور عام حالات میں پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی پہنے، اپنے دستِ مبارک سے کپڑے بھی دھوئے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی زیبِ تن فرمائے، تو ساری امت کے لیے، امت کے ہر طبقے کے لیے اپنا اسوہ چھوڑ گئے کہ کسی کے لیے بھی رہنمائی میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔

---

(۱) ماخوذ از سنن ابی داود ٤٤/٤ (٤٠٣٤) واخلاق النبی لابی الشیخ الاصبهانی ١١٠/٢ (٢٦٠) طبع دار للسلم۔ والحديث سكت عنه أبو داود. وقال المنذري في "مختصره" ٢٠/٤ (٣٨٧٦) في إسناده عمارة بن زاذان أبو سلمة، وقد تكلم فيه غير واحد. (طبع دار الكتب العلمية)۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ اس حدیث کا یہ نکلا کہ اپنے دل کی تشویش کو زائل کرنے کے لیے اور اطمینان پیدا کرنے کے لیے اگر کوئی آدمی ذخیرہ کرے تو کوئی حرج نہیں، لیکن نیت یہی ہونی چاہیے، نیت یہ نہ ہو کہ میں مالدار کہلاؤں، نیت یہ نہ ہو کہ میں اس کو مزید بڑھاؤں، ایک وادی سونے کی مل جائے تو ایک اور مل جائے، بلکہ نیت یہ ہو کہ تشویش سے میں بچ جاؤں اور میرے دل میں جمعیت پیدا ہو جائے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اپنے دل کو لگانے کے لیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے یہ حقیقت ہمارے دلوں میں مرکوز فرمادے اور اس کے اوپر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض

(اصلاحی خطبات ۹/ ۵۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ

الفساد فی الارض[1]

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

تمہید

معزز حاضرینِ کرام! یہ میرے لیے خوشی اور افتخار کا باعث ہے کہ آج آپ حضرات سے ایک دینی موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ کا یہ ادارہ جس کو ''ایوان صنعت وتجارت'' کہا جاتا ہے، یہاں عام طور پر جن لوگوں کو خطاب کی دعوت دی جاتی ہے وہ لوگ یہاں آکر یا تو تجارت کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں یا سیاست کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں، میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا سیاست سے بھی عملی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے اور تجارت سے بھی کوئی عملی رابطہ نہیں ہے، میں دین کا طلب علم ہوں اور جہاں کہیں کوئی بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا موضوع دین ہی سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا آج کی نشست میں اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں اور دین ایسی چیز ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے اس میں کوئی بات نہ کہی گئی ہو۔

آج کا موضوع

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ صرف مسجد اور عبادت

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔

گاہوں کی حد تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے پر حاوی ہے، چنانچہ آج کی گفتگو کے لیے مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں "موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض" کے موضوع پر گفتگو کروں، چنانچہ اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ صحیح بات، حق طریقے سے، حق نیت سے کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دین صرف مسجد تک محدود نہیں

بات در اصل یہ ہے کہ جب سے ہماری امت پر سیاسی اور سماجی زوال کا آغاز ہوا اس وقت سے یہ عجیب وغریب فضا بن گئی کہ دین کو ہم نے دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند عبادتوں کی حد تک محدود کر دیا ہے، جب تک ہم مسجد میں ہیں یا اپنے گھر میں عبادت انجام دے رہے ہیں اس وقت تک تو ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام یاد آجاتے ہیں، لیکن جب ہم زندگی کی عملی کشاکشی میں داخل ہوتے ہیں اور بازار میں پہنچتے ہیں یا سیاست کے ایوانوں میں پہنچتے ہیں یا معاشرے کے دوسرے عملی گوشوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت دین کے احکام اور دین کی تعلیمات ہمارے ذہنوں میں نہیں رہتیں۔

تلاوت قرآنِ کریم سے آغاز

ہمارے درمیان یہ بڑا اچھا رواج جاری ہے کہ ہماری امت مسلمہ میں ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآنِ کریم سے ہوتا ہے، وہ چاہے اسمبلی کی محفل ہو یا اقتدار کی کوئی تقریب ہو یا ایوان صنعت وتجارت کی کوئی تقریب ہو، الحمد للہ سب

سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ کا کلام پڑھا جاتا ہے، لیکن یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ جس وقت وہ کلام پڑھا جارہا ہے اس وقت تک تو اس کے احترام اور اس کی تعظیم وتکریم کا خیال ذہن میں آتا ہے، لیکن جونہی اس قرآنِ کریم کی تلاوت ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد عملی جدو جہد کا آغاز ہوتا ہے اس مرحلے پر وہ قرآن کریم یاد نہیں رہتا۔

قرآن کریم ہم سے فریاد کر رہا ہے

ہمارے دور کے ایک شاعر گزرے ہیں ''ماہر القادری صاحب مرحوم'' انہوں نے قرآنِ کریم کی فریاد پر ایک نظم کہی ہے، اس نظم میں انہوں نے قرآنِ کریم کو ایک فریادی کی شکل میں دکھایا ہے، وہ اس طرح فریاد کر رہا ہے کہ ؂

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لیے
تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے
ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں

یعنی مجھے ہر وقت طاقوں میں سجا کر رکھا ہوا ہے، خوشبو میں بسا کر رکھا ہوا ہے اور ہر مجلس کا آغاز میری تلاوت سے ہوتا ہے، مجھ سے برکت حاصل کی جاتی ہے اور جب لوگوں کے درمیان جھگڑے پیش آتے ہیں تو پھر مجھے ہاتھوں میں اٹھا کر قسمیں دی جاتی ہیں، میرے ساتھ یہ سب سلوک ہورہا ہے اور زبان سے

میری محبت اور تعظیم کے دعوے کیے جا رہے ہیں، لیکن جس قانون پر ہم چل رہے ہیں اور جس اندازِ زندگی کو اختیار کیا ہوا ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے قرآن! ''نعوذ باللہ'' تیری ہدایت کی ہمیں ضرورت نہیں۔

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

جن صاحب نے اس وقت جن آیات کی تلاوت فرمائی ہے، وہ بے موقع تلاوت کی ہیں، ان آیات میں ارشاد ہے کہ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔ (۱)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔

یہ نہ ہو کہ مسجد میں جب تک ہو اس وقت تک تم مسلمان ہو اور بازار میں مسلمان نہ ہو اور اقتدار کے ایوان میں مسلمان نہ ہو، بلکہ تم ہر جگہ مسلمان ہو۔

بہر حال! آج کی نشست کا موضوع یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ''موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض کیا ہیں؟'' اس موضوع کے سلسلے میں میں نے آپ کے سامنے قرآنِ کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے، اس کی تھوڑی سی تشریح پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن تشریح کرنے سے پہلے موجودہ دور کا ایک تمہیدی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ اگر موجودہ حالات کے پس منظر میں جب اس آیت کی تشریح سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو شاید زیادہ فائدہ ہوگا۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۰۸)۔

دو معاشی نظریے

ہم اور آپ اس وقت ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جس میں یہ کہا اور سمجھا جارہا ہے کہ انسان کی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ''معاش کا مسئلہ'' ہے اور اسی بنیاد پر اس دور میں دو معاشی نظریوں کے درمیان پہلے فکری اور پھر عملی تصادم رونما ہوا، ایک ''سرمایہ دارانہ معیشت'' کا نظریہ اور دوسرا ''اشتراکی معیشت کا نظریہ'' ان دونوں نظریوں کے درمیان پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زبردست ٹکراؤ رہا اور فکری اور عملی دونوں سطح پر یہ دونوں نظریے برسرِ پیکار رہے، دونوں کے پیچھے ایک فلسفہ اور ایک نظریہ تھا۔ چوہتر (۷۴) سال گزرنے کے بعد ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اشتراکی معیشت کا جو نظر فریب ایوان تھا وہ بیٹھ گیا اور دنیا نے پر فریب نظریہ کی حقیقت کو عملی تجربہ گاہ میں پہچان لیا اور اشتراکیت بحیثیت ایک انقلابی نظام کے فیل ہوگئی۔

اشتراکیت کے وجود میں آنے کے اسباب

لیکن یہ بات سوچنے کی ہے کہ اشتراکیت کیوں وجود میں آئی تھی؟ اور اس کے پیچھے کیا اسباب اور کیا عواملِ کار تھے؟ جن لوگوں نے دنیا کے مختلف معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت اشتراکیت ایک ردِعمل تھا، سرمایہ دارانہ نظام کے اندر جو امیر اور غریب کے درمیان زبردست دیواریں حائل ہیں اور دولت کی تقسیم کا نظام غیر منصفانہ ہے، اس غیر منصفانہ نظام کے ردِ عمل کے طور پر اشتراکیت وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر فرد کو اتنی آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے، اس پر کسی طرح کی قید اور

پابندی نہیں، آزاد معیشت اور آزاد تجارت کے نظریہ کے تحت اس کو کھلی چھٹی فراہم کی گئی اور اس کھلی چھٹی کے نتیجے میں دولت کی تقسیم کا نظام ناہموار ہوگیا اور امیر اور غریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوگئیں، غریب کے حقوق پامال ہوئے، اس کے ردِعمل کے طور پر اشتراکیت کا نظام وجود میں آیا، جس نے کہا کہ

''فرد کو کوئی آزادی نہیں ہونی چاہیے اور سرکاری منصوبہ بندی کے تحت معیشت کو کام کرنا چاہیے''۔

سرمایہ دارانہ نظام میں خرابیاں موجود ہیں

یہ بات ٹھیک ہے کہ اشتراکی نظام ناکام اور فیل ہوگیا، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کی وجہ سے اشتراکی نظام وجود میں آیا تھا کیا وہ خرابیاں دور ہوگئیں؟ وہ ناانصافیاں جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پائی جاتی تھیں کیا ان کا کوئی مناسب حل نکل آیا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں جو خرابیاں تھیں وہ اپنی جگہ برقرار ہیں۔

سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ

اور یہ مقامِ عبرت ہے کہ جس تاریخ میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا اور امریکی رسالے ''ٹائم'' (Time) کے جس شمارے میں یہ خبر اور اس پر تبصرے شائع ہوئے کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا اور اشتراکیت کا بت پاش پاش ہوگیا، ٹھیک اسی شمارے میں امریکی نظامِ حیات کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اسی بات پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ اس وقت امریکی نظام میں

اپنی خدمات کے عوض سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ کون سا ہے؟ اس مضمون میں کہا گیا تھا کہ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ''ماڈل گرلز'' کا طبقہ ہے، جو ماڈلنگ کر کے پیسے کماتی ہیں اور اس مضمون میں یہ لکھا تھا کہ بعض ماڈل گرل ایسی ہیں جو ایک دن کی خدمات کا معاوضہ ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہیں، اس سے زیادہ کمانے والا طبقہ اور کوئی نہیں ہے۔ یہ ۲۵ ملین ڈالر جو ایک ماڈل گرل کو دیے جارہے ہیں یہ کون ادا کر رہا ہے؟ اور کس کی جیب سے یہ رقم جارہی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ۲۵ ملین ڈالر آخر کار صارفین سے وصول کیے جائیں گے، ایک ہی شمارے میں یہ دونوں باتیں پڑھ کر مجھے عبرت ہورہی تھی کہ ایک طرف تو یہ دعویٰ کر کے بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ ہم نے اشتراکیت کے بت کو پاش پاش کردیا، لیکن جس چیز نے اشتراکیت کو جنم دیا تھا اس چیز کی طرف کسی کی نظر اور کسی کو فکر نہیں۔ آج آپ نے اشتراکیت کے ایک بت کو تو پاش پاش کردیا، لیکن اس کے اصل سبب اور محرک کو ختم نہیں کیا تو کل پھر ایک اور اشتراکیت ابھر کر سامنے آجائے گی، پہلی اشتراکیت نے انسانیت کو زخم دیے، پھر دوسری اشتراکیت آکر اس سے زیادہ زخم لگائے گی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اصل خرابی

صحیح بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں فرد کو منافع کمانے کی مکمل آزادی دی گئی ہے اور نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ درحقیقت خرابی اس وجہ سے تھی کہ اس نظامِ معیشت میں حلال وحرام کی کوئی تقسیم نہیں تھی، جائز اور ناجائز کی کوئی

تقسیم نہیں تھی، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعے جو دین اور معیشت کا جو نظام ہمیں عطا فرمایا ہے اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگرچہ انسان اپنی معیشت اور تجارت میں آزاد ضرور ہے، لیکن اپنے خالق اور مالک کے بتائے ہوئے احکام کا پابند بھی ہے، لہٰذا اس کی تجارت، اس کی صنعت اور اس کی معیشت حلال وحرام کے اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے اور جب تک حلال وحرام کے ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تجارت اور معیشت کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوگا اس وقت تک اسی قسم کے بے اعتدالیوں اور ناکامیوں کا راستہ کھلا رہے گا۔

ایک امریکی افسر سے ملاقات

جس زمانے میں سود کے بارے میں "فیڈرل شریعت کورٹ" کا فیصلہ منظر عام پر آیا، اس وقت پاکستان میں امریکی سفارت خانے کے معاشی امور کے انچارج میرے پاس آئے اور اس فیصلے کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کیں، اس وقت اشتراکیت کی ناکامی کا تازہ تازہ واقعہ پیش آیا تھا، میں نے آخر میں ان سے گزارش کی کہ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آج امریکہ کا ڈنکا بج رہا ہے اور بلاشبہ آپ لوگوں نے عالمی سطح پر اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے کہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ پوری دنیا میں اس وقت صرف ایک سپر طاقت ہے، دوسری کوئی طاقت نہیں، لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کی اس ناکامی کے بعد کیا آپ نے کبھی اس پہلو پر غور کیا کہ جن اسباب کے نتیجے میں یہ اشتراکیت ابھری تھی کیا وہ اسباب ختم ہوگئے ہیں؟ اور کیا اب دوبارہ ان اسباب پر غور کرنے کی ضرورت نہیں؟ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ

اگر اس وقت کوئی شخص کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی اپنی جگہ پر ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا ایک حل ہمارے پاس موجود ہے اور وہ یہ کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے حلال وحرام کے اصولوں کی بنیاد پر اپنی معیشت کے اصولوں کو استوار کرنا ہے، تو آپ کی طرف سے اس کو بنیاد پرستی کے طعنے دیے جاتے ہیں، اس کو (fundamentalist) کہا جاتا ہے، اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے، آپ یہ بتائیے کہ آپ کے خیال میں کیا کوئی تیسرا تصور وجود ہی میں نہیں آسکتا؟ آپ اس پر غور کرنے کے لیے کیوں تیار نہیں؟

وہ کافی توجہ سے میری بات سنتے رہے، بعد میں انہوں نے کہا کہ بات در اصل یہ ہے کہ ہمارے جو ذرائع ابلاغ ہیں انہوں نے بلاشبہ اسلامی احکام اور تعلیمات کو بڑا مسخ کرکے پیش کرنا شروع کردیا ہے، میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں اور سود کے بارے میں جس طرح آپ نے وضاحت سے بتایا، اس طرح وضاحت کے ساتھ میں نے پہلی بار یہ مسئلہ سنا ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈے کے خوگر ہیں، اس وجہ سے جب بھی اس قسم کی کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کردیتے ہیں اور یہ ان کا اچھا طرزِ عمل نہیں ہے۔

صرف اسلام کا نظامِ معیشت منصفانہ ہے

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر دوسرے لوگ اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام کے بارے میں ایسی باتیں کریں تو ان کو معذور سمجھا جاسکتا ہے، اس لیے

کہ انہوں نے ''اسلام'' کو سمجھا ہی نہیں، اسلام کو پڑھا ہی نہیں، اسلام پر ان کو اعتقاد ہی نہیں، اسلام ان کو کیا سکھاتا ہے اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں، لیکن ہم اور آپ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور کلمہ لا إله إلا الله محمد رسول الله پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنی ہر مجلس کا آغاز تلاوتِ قرآنِ کریم سے کرتے ہیں، ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ہم اسلام کے اس عظیم پہلو سے اپنے آپ کو غافل اور بے خبر رکھیں اور بات کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ ہمارے دینِ اسلام نے معیشت کے میدان میں ہمیں کیا تعلیم دی ہے؟ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اشتراکیت ناکام ہوچکی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہیں، ایسے معاشرے میں اگر کوئی نظام انسانیت کے لیے ایک اعتدال کی راہ پیش کرسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا نظام ہے، اس یقین کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اگر اس آیتِ کریمہ پر غور کیا جائے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے تو اس میں ہماری اور آپ کی رہنمائی کے لیے بڑا سامان ہے۔

قارون اور اس کی دولت

یہ آیتِ کریمہ سورۂ قصص کی آیت ہے، اس آیت میں قارون کو خطاب کیا گیا ہے، یہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بہت دولت مند شخص تھا، چنانچہ قارون کا خزانہ بہت مشہور ہے، یہ اتنا بڑا دولت مند تھا کہ اس کی دولت کی کثرت کو بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے فرمایا:

إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ (۱)

یعنی اس کے خزانوں کی چابیاں اتنی زیادہ تھیں کہ ایک بڑی جماعت مل کر ان چابیوں کو اٹھا پاتی تھی، اس زمانے میں چابیاں بھی بڑی وزنی ہوا کرتی تھیں، پھر اس کے خزانے بہت پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے اس کو جو ہدایات دیں وہ اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہیں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، اگرچہ اس آیت میں براہ راست خطاب تو قارون کو ہے، لیکن اس کے واسطے سے ہر اس شخص کو خطاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہو۔

قارون کو چار ہدایات

چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ (۲)

یہ چار جملے ہیں: ''پہلے جملے'' میں فرمایا کہ جو کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو (دولت) عطا فرمائی ہے، اس کے ذریعے آخرت کی فلاح وبہبود کو طلب کرو۔ ''دوسرے جملے'' میں فرمایا کہ (یہ نہ ہو کہ آخرت کی فلاح طلب کرنے کے لیے ساری دولت لٹادو اور دنیا میں اپنے پاس دولت بالکل نہ رکھو، بلکہ) دنیا کا جو

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۶)۔
(۲) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔

حصہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقرر فرمایا ہے اس کو مت بھولو (اس کو اپنے پاس رکھو، اس کا حق ادا کرو)۔ ''تیسرے جملے'' میں ارشاد فرمایا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ دولت عطا کر کے) احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان اور اچھائی کا معاملہ کرو اور ''چوتھے جملے'' میں ارشاد فرمایا کہ اپنی اس دولت کے بل بوتے پر زمین میں فساد مت مچاؤ (اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش مت کرو)۔ اس آیت میں یہ چار ہدایات قارون کو دیں، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ چار ہدایات ایک تاجر کے لیے ایک صنعت کار کے لیے اور ایک ایسے مسلمان کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر کچھ بھی عطا فرمایا ہو، ایک پورا نظامِ عمل پیش کر رہی ہیں۔

پہلی ہدایت

سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ تم میں اور ایک غیر مسلم میں فرق یہ ہے کہ غیر مسلم جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ دولت مجھے حاصل ہے یہ سب میرے قوتِ بازو کا کرشمہ ہے، میں اپنی محنت سے، اپنی صلاحیت اور جدوجہد سے اس کو کمایا اور حاصل کیا ہے، لہٰذا میں اس دولت کا بلاشرکتِ غیر مالک ہوں اور کسی شخص کو میری دولت میں مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں، یہ دولت میری ہے، یہ مال میرا ہے، میں نے اپنی قوتِ بازو کے بل پر اسے کمایا ہے، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس کو کمایا ہے، لہٰذا میں اس دولت کو کمانے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں اور اس کو خرچ کرنے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

قومِ شعیب اور سرمایہ دارانہ ذہنیت

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے یہ کہا تھا کہ

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ (۱)

(یعنی جو آپ ہمیں منع کر رہے ہیں کہ کم مت ناپو، کم مت تولو، انصاف سے کام لو، حلال وحرام کی فکر کرو، تو یہ آپ نے ہمارے معاشی مسائل میں کہاں دخل اندازی شروع کردی، تم اگر نماز پڑھنا چاہو تو اپنے گھر جا کر نماز پڑھو) کہا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جس کی ہمارے آباء واجداد عبادت کیا کرتے تھے یا ہمارا جو مال ہے اس میں ہم جو چاہیں کرنا چھوڑ دیں، حقیقت میں یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے کہ یہ مال ہمارا ہے، یہ دولت ہماری ہے، اس پر ہمارا سکہ چلے گا، تصرف ہمارا ہے، ہم جس طرح چاہیں گے کریں گے، جس طرح چاہیں گے کمائیں گے اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی بھی یہی ذہنیت تھی، اس کی تردید میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو دولت تمہارے پاس ہے یہ کلی طور پر تمہاری نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲)

---

(۱) سورۃ هود آیت (۸۷)۔
(۲) سورۃ آل عمران آیت (۱۹)۔

آسمان وزمین میں جو کچھ ہے یہ وہ اللہ کی ملکیت ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمادی ہے، اس لیے فرمایا: وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ یعنی جو مال اللہ نے تمہیں دیا اس کے ذریعے آخرت طلب کرو، یہ نہیں فرمایا کہ وَابْتَغِ فِیْ مَالِكَ اپنے مال کے ذریعے آخرت طلب کرو۔

مال ودولت اللہ کی عطا ہے

لہٰذا پہلی بات یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے چاہے وہ نقد روپیہ ہو، چاہے وہ بینک بیلنس ہو، چاہے وہ صنعت ہو یا تجارت ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، بے شک اس کو حاصل کرنے میں تمہاری جد وجہد اور کوشش کو بھی دخل ہے، لیکن تمہاری یہ کوشش دولت حاصل کرنے کے لیے علتِ حقیقی کا درجہ نہیں رکھتی، اس لیے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو محنت اور کوشش کرتے ہیں مگر مال ودولت حاصل نہیں کر پاتے، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس دولت ہے، لیکن محنت کے ذریعے مزید دولت حاصل نہیں کر پاتے، یہ دولت اللہ کی عطا ہے، لہٰذا یہ تصور ذہن سے نکال دو کہ یہ دولت تمہاری ہے، بلکہ دولت اللہ کی ہے اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے تمہیں عطا فرمائی ہے، اس آیت سے ایک ہدایت تو یہ دے دی۔

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق ہیں

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق ہیں۔ ''پہلا فرق'' یہ ہے کہ مسلمان اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے، جبکہ غیر مسلم اس دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا نہیں سمجھتا، بلکہ اس دولت کو اپنی قوتِ بازو کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ ''دوسرا فرق'' یہ ہے کہ

ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس دولت کو آخرت کی فلاح وبہبود کا ذریعہ بنائے اور دولت کو حاصل کرنے اور اس کو خرچ کرنے میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف نہ ہو، تاکہ یہ دنیا اس کے لیے دین کا ذریعہ بن جائے اور آخرت کی فلاح وبہبود کا ذریعہ بن جائے، یہی دنیا ہے کہ اگر اس کے حصول میں انسان کی نیت درست ہو اور اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے حلال وحرام کے احکام کی پابندی ہو تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے اور یہی دنیا آخرت کا ذریعہ بن جاتی ہے اور ''تیسرا فرق'' یہ ہے کہ ایک مسلمان بھی کھاتا ہے اور کماتا ہے اور ایک غیر مسلم بھی کھاتا اور کماتا ہے، لیکن غیر مسلم کے دل میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا تصور ہوتا ہے اور نہ اس کے احکام کی پابندی کا خیال ہوتا ہے، جبکہ مسلمان کے دل میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ دنیا دین بنا دی۔

اگر ایک تاجر اس نیت کے ساتھ تجارت کرے کہ میں دو وجہ سے تجارت کر رہا ہوں: ایک تو اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے ذمے کچھ حقوق عائد کیے ہیں، میرے نفس کے بھی حقوق ہیں، میرے بچوں کے میرے ذمے کچھ حقوق ہیں، میری بیوی کے میرے ذمے کچھ حقوق ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لیے یہ تجارت کر رہا ہوں۔ دوسرے اس لیے میں تجارت کر رہا ہوں کہ اس تجارت کے ذریعے میں معاشرے میں ایک چیز فراہم کرنے کا ذریعہ بن جاؤں اور مناسب طریقے سے ان کی اشیاء ضرورت ان تک پہنچاؤں۔ اگر تجارت کرتے وقت دل میں یہ دو نیتیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ حلال طریقے کو اختیار کرے اور حرام طریقے سے بچے تو پھر یہ ساری تجارت عبادت ہے۔

تاجروں کی دو قسمیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء"(۱)

یعنی ایک امانت دار اور سچا تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، لیکن اگر تجارت کے اندر نیت صحیح نہ ہو اور حلال وحرام کی فکر نہ ہو تو پھر ایسے تاجر کے بارے میں پہلی حدیث کے برخلاف دوسری حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"التجار يحشرون يوم القيامة فجارا إلا من اتقى الله وبرّ وصدق"(۲)

یعنی تجار قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے، "فجار" کے معنی ہیں فاسق وفاجر، نافرمان، گناہ گار، سوائے اس تاجر کے جو تقویٰ اختیار کرے، نیکی اختیار کرے اور سچائی اختیار کرے، اگر یہ تین شرطیں موجود نہیں ہیں تو وہ تاجر فجار میں شامل ہے اور اگر یہ تین شرطیں موجود ہیں تو پھر وہ انبیاء اور صدیقین اور اور شہداء کی صف میں شامل ہے، ایسے تاجر کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام بخشا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی ۴۹۸/۲ (۱۲۰۹) وقال هذا حديث حسن۔ وسنن ابن ماجه ۵۱۰/۳ (۲۱۳۹)۔

(۲) سنن الترمذی ۴۹۹/۲ (۱۲۱۰) وقال هذا حديث حسن صحيح۔ وسنن ابن ماجه ۵۱٤/۳ (۲۱٤٦)۔

بہرحال! پہلا مرحلہ نیت کی درستی ہے اور دوسرا مرحلہ عمل کے اندر حلال وحرام کا امتیاز ہے، یہ نہ ہو کہ مسجد کی حد تک تو وہ مسلمان ہے، لیکن مسجد سے باہر نکلنے کے بعد اس کو اس بات کوئی پرواہ نہ ہو کہ میں جو کاروبار کرنے جارہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس دوسرے مرحلے پر مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں، ایک غیر مسلم سودی کاروبار کر رہا ہے تو مسلمان بھی سودی کاروبار کر رہا ہے، غیر مسلم قمار کا کام کر رہا ہے تو مسلمان بھی کر رہا ہے، اگر کسی مسلمان تاجر کے اندر یہ بات ہے تو پھر ایسا تاجر اس وعید کے اندر داخل ہے جو دوسری حدیث میں نے اوپر عرض کی اور اگر یہ بات نہیں تو پھر وہ تاجر پہلی حدیث میں بیان کی گئی بشارت کا مستحق ہے۔

دوسری ہدایت

اب دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ اسلام نے ہماری تجارت کا راستہ بھی بند کردیا اور یہ فرمادیا کہ بس آخرت ہی کو دیکھو، دنیا کو مت دیکھو اور دنیا کے اندر اپنی ضروریات کا خیال نہ کرو، اس خیال کی تردید کے لیے قرآنِ کریم نے فوراً دوسرے جملے میں دوسری ہدایت یہ فرمائی کہ

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۱)

یعنی ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم دنیا کو بالکل چھوڑ کر بیٹھ جاؤ، بلکہ تمہارا دنیا کا جو حصہ ہے اس کو مت بھولو، اس کے لیے جائز اور حلال طریقے اختیار کرنے کی کوشش کرو۔

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔

یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں

لیکن قرآنِ کریم کے اندازِ بیان نے ایک بات اور واضح کردی کہ تمہارا بنیادی مسئلہ اس زندگی کے اندر ''معاش کا مسئلہ'' نہیں۔ بے شک قرآن وحدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاش کے مسئلے کو تسلیم کیا ہے، لیکن یہ معاش کا مسئلہ تمہاری زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، ایک کافر اور مؤمن میں یہی فرق ہے کہ کافر اپنی ساری زندگی کا بنیادی مسئلہ اس کو سمجھتا ہے کہ میری پیدائش سے لے کر مرتے دم تک میرے کھانے کمانے کا کیا انتظام ہے، اس سے آگے کی سوچ اور فکر نہیں جاتی، لیکن ایک مسلمان کو قرآن وحدیث یہ تعلیم دیتے ہیں کہ بے شک معاشی سرگرمیوں کی تمہیں اجازت ہے، لیکن یہ تمہاری زندگی کا بنیادی مقصد نہیں ہے، اس لیے کہ یہ زندگی خدا جانے کتنے دنوں کی ہے، آج بھی ختم ہوسکتی ہے، کل بھی ختم ہوسکتی ہے، ہر لمحے اس زندگی کے ختم ہونے کا امکان موجود ہے۔ آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے موت سے انکار کیا ہو، خدا کا انکار کرنے والے دنیا میں موجود ہیں، لیکن موت سے انکار کرنے والا کوئی نہیں، اس دنیا سے ضرور جانا ہے اور اگر تم مسلمان ہو تو تمہارا یہ اعتقاد ہوگا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے، وہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔

کیا انسان ایک معاشی جانور ہے؟

ذرا اسی عقل رکھنے والے انسان کو بھی یہ بات سوچنی چاہیے کہ اس کو اپنی جدوجہد اور اپنی زندگی کا بنیادی مقصد اس چند روزہ زندگی کو بنانا چاہیے یا اس

آنے والی دائمی زندگی کو اپنا مقصد بنانا چاہیے؟ ایک مسلمان جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام پر ایمان رکھتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد صرف کھا پی کر پورا نہیں ہوجاتا، صرف زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ جمع کر کے پورا نہیں ہوجاتا کیونکہ اگر ایسا ہوجائے تو پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ انسان کی تعریف میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان ایک معاشی جانور (Economic Animal) ہے، یہ تعریف درست نہیں، اس لیے اگر انسان صرف (Economic Animal) ہوتا تو پھر انسان میں اور بیل، گدھے اور کتے میں کوئی فرق نہ ہوتا، اس لیے کہ یہ جانور کھانے پینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اگر انسان بھی صرف کھانے پینے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا، اللہ تعالیٰ نے سارے جانوروں کے لیے رزق کے دروازے کھولے ہیں، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، لیکن انسان کو جانوروں سے جو امتیاز عطا فرمایا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے اور اس عقل کے ذریعے وہ یہ سوچے کہ آئندہ آنے والی زندگی ایک دائمی زندگی ہے اور وہ زندگی اس موجودہ زندگی پر فوقیت رکھتی ہے۔

بہرحال اس دوسرے جملے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ دنیا سے اپنا حصہ مت بھولو، لیکن یہ یاد رکھو کہ زندگی کا اصل مقصود دارِ آخرت ہے اور یہ جتنی معاشی سرگرمیاں ہیں یہ راستے کی منزل ہیں، یہ خود منزلِ مقصود نہیں۔

تیسری ہدایت

پھر تیسرے جملے میں یہ ہدایت دی کہ

وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ [1]

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ دولت عطا کر کے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں پر احسان کرو، اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتا دیا کہ حلال وحرام میں فرق کرو اور حرام کے ذریعے مال حاصل نہ کرو اور دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ جو چیز حلال طریقے سے حاصل کی ہے اس کے بارے میں بھی یہ مت سمجھو کہ میں اس کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہوں، بلکہ اس کے ذریعے تم دوسروں پر احسان کا معاملہ کرو اور احسان کرنے کے لیے زکوۃ اور صدقات وخیرات کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

چوتھی ہدایت

چوتھے جملے میں یہ ہدایت دی کہ

وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِى الۡاَرۡضِ [2]

زمین میں فساد مت پھیلاؤ، یعنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے حقوق پر ڈاکا مت ڈالو، دوسروں کے حقوق غصب مت کرو۔ اگر تم نے ان چار ہدایات پر عمل کر لیا تو تمہاری یہ دولت، تمہارا یہ سرمایہ اور تمہاری یہ معاشی سرگرمیاں تمہارے لیے مبارک ہیں اور تم انبیاء، صدیقین اور شہداء کی فہرست میں شامل ہو، اور اگر تم نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا تو پھر تمہاری ساری معاشی سرگرمیاں بے کار ہیں اور آخرت میں اس کا نتیجہ سزا اور عذاب کی صورت میں سامنے آئے گا۔

---

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔
(۲) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔

دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں

بہرحال! اس وقت ہمارے مسلمان تاجروں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآنِ کریم کی ان چار ہدایتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اس دنیا کے سامنے جو سرمایہ داری سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے اور اشتراکیت سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے اور ایسا نمونہ پیش کریں جو دوسروں کے لیے باعثِ کشش ہو، جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اس دور کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرے گا۔

کیا ایک آدمی معاشرے میں تبدیلی لاسکتا ہے؟

آج کل یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک نظام نہ بدلے اور جب تک سب لوگ نہ بدلیں، اس وقت تک اکیلا آدمی کیسے تبدیلی لا سکتا ہے؟ اور اکیلا آدمی ان چار ہدایتوں پر کس طرح عمل کرسکتا ہے؟ یاد رکھیے! نظام اور معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی جگہ یہ سوچتا رہے گا کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا اس وقت تک میں بھی نہیں بدلوں گا، تو پھر معاشرے میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی، تبدیلی ہمیشہ اس طرح آیا کرتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ بن کر اپنی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے، پھر اس چراغ کو دیکھ کر دوسرا چراغ جلتا ہے اور دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اسی طرح افراد کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے اور افراد سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے، لہٰذا یہ عذر کہ میں تنہا کچھ نہیں کرسکتا یہ معقول عذر نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح تبدیلی لائے؟

جب نبی کریم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اس وقت معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں، اس وقت اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سوچتے کہ اتنا بڑا معاشرہ الٹی سمت کی طرف جارہا ہے، میں تنہا کیا کرسکوں گا اور یہ سوچ کر آپ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے تو آج ہم اور آپ یہاں پر مسلمان بیٹھے ہوئے نہ ہوتے۔ آپ نے دنیا کی مخالفتوں کے سیلاب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک راہ ڈالی، نیا راستہ نکالا اور اس راستے پر گامزن ہوئے، یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ کو اس راستے میں قربانیاں بھی دینی پڑیں، آپ کو پریشانیاں بھی پیش آئیں، مشکلات بھی سامنے آئیں، لیکن آپ نے ان سب کو گوارہ کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کی ایک تہائی آبادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نام لیوا اور ان کی غلام ہے، لیکن اگر آپ یہ سوچ کر بیٹھ جاتے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا اس وقت تک تنہا میں کیا کرسکتا ہوں؟ تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

ہر شخص اپنے اندر تبدیلی لائے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی ذمہ داری اس کے اپنے اوپر ڈالی ہے، لہٰذا اس بات کو دیکھے بغیر کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل کو درست کرے اور کم از کم اس بات کی طلب ہمارے دلوں میں پیدا ہوجائے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں معیشت کے میدان میں اور تجارت وصنعت کے میدان میں کن احکام کا پابند کیا ہے؟ ان احکام پر ہم کس طرح عمل کرسکتے ہیں، اس کی معلومات حاصل کرکے اس پر عمل کرنے کا جذبہ اور

عزم پیدا ہوجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجلس ان شاء اللہ بڑی مبارک اور مفید ہے، ورنہ نشستن و گفتن و برخاستن والی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ جذبہ اور یہ تصوّر اور یہ خیال اور یہ عزم ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمادے جو اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری دنیا وآخرت دونوں سنوار دے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

رزقِ حلال کی طلب
ایک دینی فریضہ

(اصلاحی خطبات ۱۰/۱۸۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رزقِ حلال کی طلب ایک دینی فریضہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عن عبد اللّٰه بن مسعود رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰه ﷺ قال:

"طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة"(۱)

رزقِ حلال کی طلب دوسرے درجے کا فریضہ

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رزقِ حلال کی طلب کرنا دین کے اوّلین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

اگر چہ سند کے اعتبار سے محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، لیکن علماءِ امّت نے اس حدیث کو معنی کے اعتبار سے قبول کیا ہے اور اس بات پر ساری امّت کے علماء کا اتفاق ہے کہ معنی کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے۔ اس

---

(۱) السنن الكبرى للبيهقى ٢١١/٦ (١١٦٩٥) طبع دار الكتب العلمية والمعجم الكبير للطبرانى ٧٤/١٠ (٩٩٩٣) طبع مكتبة ابن تيمية القاہرة۔وأورده الهيثمي في "المجمع ٥٢٠/١٠(١٨٠٩٨) وقال: رواه الطبراني، وفيه عباد بن كثير الثقفي، وهو متروك. وذكره السخاوي في "المقاصد الحسنة" ص٣١٦ (٨٠١) وقال: الطبراني، والبيهقي في "الشعب"، والقضاعي، من جهة عباد بن كثير، عن الثوري، عن منصور، عن إبراهيم، عن علقمة، عن ابن مسعود، به، مرفوعًا، وقال البيهقي: تفرد به عباد، وهو ضعيف، قال أبو أحمد الفراء: سمعت يحيى بن يحيى يسأل عن حديث عباد في الكسب، فإذا انتهى إلى رسول الله ﷺ قال: إن كان قاله، وله شواهد، منها عن ابن مسعود مرفوعًا، أخرجه الطبراني، وعن أنس رفعه ولفظه: "طَلَبُ الحلَالِ وَاجِبٌ عَلى كُلِّ مُسْلِمٍ"، أخرجه الطبراني في "الأوسط"، والديلمي، وعن ابن عباس مرفوعًا: "طَلَبُ الحلَالِ جِهَادٌ"، رواه القضاعي من حديث محمد بن الفضل عن ليث بن أبي سليم عن مجاهد عنه، وهو عند أبي نعيم في "الحلية"، ومن طريقه الديلمي عن ابن عمر، وبعضها يؤكد بعضًا، لا سيما وشواهدها كثيرة. (طبع دار الكتب العلمية)۔
از مرتب عفا اللہ عنہ

حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم اصول بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ رزقِ حلال کو طلب کرنا دین کے اوّلین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔ یعنی دین کے اوّلین فرائض تو وہ ہیں جو ارکانِ اسلام کہلاتے ہیں اور جن کے بارے میں ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ چیزیں دین میں فرض ہیں۔ مثلاً: نماز پڑھنا، زکوٰۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ، یہ سب دین کے اوّلین فرائض ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ''رزقِ حلال کو طلب کرنا اور رزق حلال کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا'' ہے۔ یہ ایک مختصر سا ارشاد اور مختصر سی تعلیم ہے، لیکن اس حدیث میں بڑے عظیم علوم بیان فرمائے گئے ہیں۔ اگر آدمی اس حدیث میں غور کرے، تو دین کی فہم عطا کرنے کے لیے اس میں بڑا سامان ہے۔

رزقِ حلال کی طلب دین کا حصہ ہے

اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہم اور آپ رزقِ حلال کی طلب میں جو کچھ کارروائی کرتے ہیں چاہے وہ تجارت ہو، چاہے وہ کاشت کاری ہو، چاہے وہ ملازمت ہو، چاہے وہ مزدوری ہو، یہ سب کام دین سے خارج نہیں ہیں،، بلکہ یہ سب بھی دین کا حصہ ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہ کام جائز اور مباح ہیں، بلکہ ان کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، اور نماز روزے کے فرائض کے بعد اس کو بھی دوسرے درجے کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کام نہ کرے اور رزقِ حلال کی طلب نہ کرے، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ جائے تو وہ شخص فریضہ ترک کرنے کا گناہ گار ہوگا، اس لیے کہ اس نے ایک فرض اور واجب کام کو چھوڑ رکھا ہے، کیونکہ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان سست اور

بے کار ہو کر نہ بیٹھ جائے اور کسی دوسرے کا دستِ نگر نہ بنے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اور ان چیزوں سے بچنے کا راستہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنی وسعت اور کوشش کے مطابق رزقِ حلال طلب کرتا رہے، تا کہ کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق ہمارے اوپر واجب فرمائے ہیں، اسی طرح کچھ حقوق ہمارے اوپر ہمارے نفس سے متعلق، ہماری ذات سے متعلق اور ہمارے گھر والوں سے متعلق بھی واجب فرمائے ہیں اور رزقِ حلال کی طلب کے بغیر یہ حقوق ادا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ان حقوق کی ادائیگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی رزقِ حلال طلب کرے۔

اسلام میں ''رہبانیت'' نہیں

اس حدیث کے ذریعے اسلام نے رہبانیت کی جڑ کاٹ دی۔ عیسائی مذہب میں رہبانیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا راستہ اور طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے دنیاوی کاروبار کو چھوڑے اور اپنے نفس اور ذات کے مطالبوں کو ختم کرے اور جنگل میں جا کر بیٹھ جائے اور وہاں اللہ اللہ کیا کرے۔ بس اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے نفسانی تقاضے رکھے، بھوک اس کو لگتی ہے، پیاس اس کو لگتی ہے، جسم ڈھانپنے کے لیے کپڑے کی ضرورت ہے، یہ سارے تقاضے ہم نے اس کے اندر پیدا کیے۔ اب ہمارا مطالبہ اس انسان سے یہ ہے کہ وہ ان تقاضوں کو پورا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے حقوق بھی ادا کرے، تب

وہ انسانِ کامل بنے گا اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تو ایسا انسان چاہے کتنا ہی ذکر وفکر میں مشغول ہو، لیکن ایسا شخص ہمارے یہاں قبولیت کا اور قرب کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور رزقِ حلال کے طریقے

دیکھیے! جتنے انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے، ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے کسبِ حلال کا کام ضرور کرایا اور حلال رزق کے حصول کے لیے سب نے جدّ وجہد کی، کوئی نبی مزدوری کرتے تھے، کوئی نبی بڑھئی کا کام کرتے تھے،(۱) کوئی نبی بکریاں چرایا کرتے تھے(۲)۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکّہ مکرمہ کے پہاڑوں پر اجرت پر بکریاں چرائیں۔ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یاد ہے کہ میں اجیادؔ کے پہاڑ پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(۳)

بہر حال! بکریاں آپ نے چرائی، مزدوری آپ نے کی، تجارت آپ نے کی، چنانچہ تجارت کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شام کے دو سفر کیے،(۴) جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کا سامانِ تجارت لے کر شام تشریف لے گئے۔ زراعت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی۔ مدینہ سے کچھ فاصلے پر مقام جُرف تھا، وہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زراعت کا کام کیا(۵)۔ لہٰذا کسبِ حلال کے جتنے

---

(۱) حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے ملاحظہ ہو صحیح مسلم ۱۸٤۷/٤ (۲۳۷۹)۔ از مرتب

(۲) صحیح البخاری ۸۸/۳ (۲۲٦۲) و ۱۵۷/٤ (۳٤۰٦)۔

(۳) السنن الکبری للنسائی ۱۷۱/۱۰ (۱۱۲٦۲) طبع موسسہ الرسالہ۔

(۴) ملاحظہ ہو دلائل النبوۃ للبیہقی ۸۵/۱ طبع دار الکتب العلمیۃ۔

(۵) اخرجہ الامام محمد فی "الاصل" ۵۲٤/۹ کتاب المزارعۃ۔ طبع دار ابن حزم۔

طریقے ہیں ان سب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود ہے۔ اگر کوئی شخص ملازمت کر رہا ہے تو یہ نیت کرلے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں یہ ملازمت کر رہا ہوں اور گر کوئی شخص تجارت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کرلے کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں تجارت کر رہا ہوں اور اگر کوئی شخص زراعت کر رہا ہے تو یہ نیت کرلے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں زراعت کر رہا ہوں۔ تو اس صورت میں یہ تمام کام دین کا حصّہ بن جائیں گے۔

مؤمن کی دنیا بھی دین ہے

اس حدیث نے ایک غلط فہمی بھی دور کردی ہے کہ دین اور چیز کا نام ہے اور دنیا کسی الگ چیز کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان غور سے دیکھے تو ایک مؤمن کی دنیا بھی دین ہے، جس کام کو وہ دنیا کا کام سمجھ رہا ہے، یعنی رزق حاصل کرنے کی فکر اور کوشش، یہ بھی درحقیقت دین ہی کا حصہ ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طریقے سے کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی اتباع میں کرے۔ بہرحال! ایک بات تو اس سے معلوم ہوئی کہ رزقِ حلال کی طلب بھی دین کا حصّہ ہے، اگر یہ بات ایک مرتبہ ذہن میں بیٹھ جائے تو بے شمار گمراہیوں کا راستہ بند ہوجائے۔

بعض صوفیاءِ کرام رحمہم اللہ کا توکل کر کے بیٹھ جانا

بعض صوفیاءِ کرام رحمہم اللہ کی طرف یہ منسوب ہے اور ان سے یہ طرزِ عمل منقول ہے کہ انہوں نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا اور رزق کی طلب میں کوئی کام نہیں کیا، بلکہ توکل کی زندگی اس طرح گزاردی کہ بس اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ غیب سے بھیج دیا، اس پر شکر کیا اور قناعت کرلی، اگر نہیں بھیجا تو صبر کرلیا۔ بعض صوفیاءِ کرام سے یہ طرزِ عمل منقول ہے۔ اس بارے میں یہ سمجھ لیں کہ صوفیاءِ کرام سے اس قسم کا جو طرزِ عمل منقول ہے وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ صوفیاءِ کرام ایسے تھے جن پر غلبۂ حال کی کیفیت طاری تھی اور وہ استغراق کے عالم میں تھے اور اپنے عام ہوش وحواس کے عالم میں نہیں تھے اور جب انسان اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو تو وہ احکامِ شریعت کا مکلف نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اگر ان صوفیاءِ کرام رحمہم اللہ نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو یہ ان کا اپنا مخصوص معاملہ تھا، تمام امت کے لیے وہ عام حکم نہیں تھا۔

یا پھر ان صوفیاءِ کرام کا توکل اتنا زبردست اور کامل تھا کہ وہ اس بات پر راضی نہ تھے کہ اگر ہم پر مہینوں فاقہ بھی گزرتا ہے تو ہمیں کوئی فکر نہیں، ہم نہ تو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے، نہ کسی کے سامنے شکوہ کریں گے۔ یہ صوفیاء بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے، بڑے اعلیٰ درجے کے مقامات پر فائز تھے، انہوں نے اسی پر اکتفاء کیا کہ ہم اپنے ذکر وشغل میں مشغول رہیں گے اور اس کے نتیجے میں فاقے کی نوبت آتی ہے تو کوئی بات نہیں اور ان کے ساتھ دوسروں کے حقوق وابستہ نہیں تھے، نہ بیوی، نہ بچے تھے کہ ان کو کھانا کھلانا ہو۔ لہٰذا یہ ان صوفیاءِ کرام کے مخصوص حالات تھے اور ان کا خاص طرزِ عمل تھا جو عام لوگوں کے لیے ہم جیسے کمزوروں کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہے۔ ہمارے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کا جو راستہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ رزقِ حلال کی طلب دوسرے دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

طلب "حلال" کی ہو

دوسری بات یہ ہے کہ رزق طلب کرنا فریضہ اس وقت ہے جب طلب حلال کی ہو، روٹی، کپڑا اور پیسہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہے، یہ نیت نہ ہو کہ بس پیسہ حاصل کرنا ہے، چاہے جس طرح بھی حاصل ہو حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے حاصل ہو۔ اس صورت میں یہ طلب، طلبِ حلال نہ ہوئی جس کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور جس کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مؤمن کا یہ عمل اس وقت دین بنتا ہے جب وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کو حاصل کرے۔ اب اگر اس نے حلال و حرام کی تمیز ہٹادی اور جائز و ناجائز کا سوال ذہن سے مٹادیا تو پھر ایک مسلمان اور کافر میں رزق حاصل کرنے کے اعتبار سے کوئی فرق نہ رہا۔ بات توجبھی بنے گی جب وہ رزق تو ضرور طلب کرے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے اندر کرے۔ اس کو ایک ایک پیسے کے بارے میں فکر لاحق ہو کہ یہ پیسہ حلال طریقے سے آرہا ہے یا حرام طریقے سے آرہا ہے، یہ پیسہ اللہ کی رضا کے مطابق آرہا ہے یا اس کے خلاف آرہا ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف آرہا ہے تو اس کو جہنّم کا انگارہ سمجھ کر چھوڑ دے، کتنی بڑی سے بڑی دولت ہو، لیکن اگر وہ حرام طریقے سے آرہی ہے تو اس کو لات مار دے اور کسی قیمت پر بھی اس حرام کو اپنی زندگی کا حصّہ بنانے پر راضی نہ ہو۔

محنت کی ہر کمائی حلال نہیں ہوتی

بعض لوگوں نے وہ ذریعۂ معاش اختیار کر رکھا ہے جو حرام ہے اور شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ مثلاً: سود کا ذریعہ معاش اختیار کیا ہوا ہے۔ اب

اگر ان سے کہا جائے کہ یہ تو ناجائز اور حرام ہے، اس طریقے سے پیسے نہیں کمانے چاہئیں، تو جواب دیا جاتا ہے کہ ہم تو اپنی محنت کا کھا رہے ہیں، اپنی محنت لگا رہے ہیں، اپنا وقت صرف کر رہے ہیں، اب اگر وہ کام حرام اور ناجائز ہے تو ہمارا اس سے کیا تعلق؟

خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر محنت جائز نہیں ہوتی، بلکہ وہ محنت جائز ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، اگر اس طریقے کے خلاف انسان ہزار محنت کرلے، لیکن اس کے ذریعے جو پیسہ کمائے گا وہ پیسے حلال نہیں ہوں گے، بلکہ حرام ہوں گے۔ اب کہنے کو تو ایک ''طوائف'' بھی محنت کرتی ہے، وہ بھی کہہ سکتی ہے کہ اپنی محنت کے ذریعے پیسے کما رہی ہوں، لہٰذا میری آمدنی حلال ہونی چاہیے۔ اسی طرح آمدنی کے جو ذرائع حرام ہیں، ان کو یہ کہہ کر حلال کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ ہمارے محنت کی آمدنی ہے، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ روزگار حلال ہے یا حرام؟

لہٰذا جب روزگار کا کوئی ذریعہ سامنے آئے تو پہلے یہ دیکھو کہ وہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ شریعت نے اس کو حلال قرار دیا ہے یا حرام؟ اگر شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو پھر اس ذریعۂ آمدنی سے خواہ کتنے ہی دنیاوی فائدے حاصل ہو رہے ہوں، انسان اس کو چھوڑ دے اور اس ذریعے کو اختیار کرے جو اللہ کو راضی کرنے والا ہو، چاہے اس میں آمدنی اور منافع کم ہو۔

بینک کا ملازم کیا کرے؟

چنانچہ بہت سے لوگ بینک کی ملازمت کے اندر مبتلا ہیں اور بینک کے اندر بہت سارا کاروبار سود پر ہوتا ہے۔ اب جو شخص وہاں ملازم ہے اگر وہ سود کے کاروبار میں ان کے ساتھ معاون بن رہا ہے تو یہ ملازمت ناجائز اور حرام ہے۔ چنانچہ علماءِ کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بینک کی ایسی ملازمت میں مبتلا ہو اور بعد میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور اس کو بینک کی ملازمت چھوڑنے کی فکر ہوجائے تو اس کو چاہیے کہ کوئی جائز ذریعۂ آمدنی اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے اور جب دوسری ملازمت مل جائے تو موجودہ ملازمت کو ترک کردے اور اس کو اختیار کرلے، چاہے اس میں آمدنی کم ہو۔

حلال روزی میں برکت

اللہ تعالیٰ نے حلال روزی کے اندر جو برکت رکھی ہے وہ حرام کے اندر نہیں رکھی۔ حرام کی بہت بڑی رقم سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو حلال کی تھوڑی سی رقم میں حاصل ہوجاتا ہے۔ حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ ہر وضو کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ (۱)

اے اللہ! میرے گناہ کی مغفرت فرما اور میرے گھر میں وسعت فرما اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔

---

(۱) سنن الترمذی ۵/۴۷۹ (۳۵۰۰) وقال: هذا حدیث غریب، وأبو السلیل اسمه ضریب بن نفیر، ویقال: ابن نقیر.

آج کل لوگ برکت کی قدر و قیمت کونہیں جانتے، روپے پیسے کی گنتی کو جانتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوش ہوجاتے ہیں کہ ہمارا بینک بیلنس بہت زیادہ ہوگیا، روپے کی گنتی زیادہ ہوگئی، لیکن اس روپے سے کیا فائدہ حاصل ہوا۔ ان روپوں سے کتنی راحت ملی، کتنا سکون حاصل ہوا؟ اس کا حساب نہیں کرتے۔ لاکھوں کا بینک بیلنس ہے، لیکن سکون میسّر نہیں، راحت میسر نہیں۔ بتایئے! وہ لاکھوں کا بینک بیلنس کس کام کا؟ اور اگر پیسے تو تھوڑے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے راحت اور سکون عطا فرمایا ہوا ہے تو یہ درحقیقت ''برکت'' ہے اور یہ ''برکت'' وہ چیز ہے جو بازار سے خرید کر نہیں لائی جاسکتی، لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی دَین ہے اور اس کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرمادیں، اسی کو یہ برکت نصیب ہوتی ہے، دوسرے کو نصیب نہیں ہوتی اور یہ برکت حلال رزق میں ہوتی ہے، حرام مال کے اندر یہ برکت نہیں رہتی، چاہے وہ حرام مال کتنا زیادہ حاصل ہوجائے۔ اس لیے انسان جو کما رہا ہے وہ اس کی فکر کرے کہ یہ لقمہ جو میرے اور میری بیوی بچوں کے حلق میں جارہا ہے اور یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے یا نہیں؟ شریعت کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ ہر انسان اپنے اندر یہ فکر پیدا کرے۔

تنخواہ کا یہ حصہ حرام ہوگیا

پھر بعض حرام مال وہ ہیں جن کا علم سب کو ہے، مثلاً: سب جانتے ہیں کہ سود حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے وغیرہ، لیکن ہماری زندگی میں ان کے علاوہ بھی بہت سی آمدنیاں اس طرح داخل ہوگئی ہیں کہ ہمیں ان کے بارے میں یہ

احساس بھی نہیں کہ یہ آمدنیاں حرام ہیں۔ مثلاً: آپ نے کسی جگہ پر جائز اور شریعت کے مطابق ملازمت اختیار کر رکھی ہے، لیکن ملازمت کا جو وقت طے ہو چکا ہے، اس وقت میں آپ کمی کر رہے ہیں اور پورا وقت نہیں دے رہے ہیں، بلکہ ڈنڈی مار رہے ہیں، جیسے ایک شخص کی آٹھ گھنٹے ڈیوٹی ہے مگر وہ ان میں سے ایک گھنٹہ چوری چھپے دوسرے کاموں میں ضائع کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مہینے کے ختم پر جو تنخواہ ملے گی اس کا آٹھواں حصہ حرام ہوگیا۔ وہ آٹھواں حصہ رزقِ حلال نہ رہا، بلکہ وہ رزقِ حرام ہوگیا، لیکن ہمیں احساس ہی نہیں کہ یہ حرام مال ہماری آمدنی میں شامل ہو رہا ہے۔

تھانہ بھون کے مدرسے کے اساتذہ کا تنخواہ کٹوانا

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی خانقاہ میں جو مدرسہ تھا، اس مدرسے کے ہر استاد اور ملازم کے پاس ایک روزنامچہ رکھا رہتا تھا۔ مثلاً: ایک استاد ہے اور اس کو چھ گھنٹے سبق پڑھانا ہے، اب سبق پڑھانے کے دوران اس کے پاس کوئی مہمان ملنے کے لیے آ گیا تو جس وقت مہمان آتا، وہ استاد اس کے آنے کا وقت اس روزنامچے میں لکھ لیتا اور پھر جب وہ مہمان رخصت ہو کر واپس جاتا تو اس کے جانے کا وقت بھی نوٹ کر لیتا۔ سارا مہینہ وہ اسی طرح کرتا اور جب مہینے کے آخر میں تنخواہ ملنے کا وقت آتا تو وہ استاد دفتر میں ایک درخواست دیتا کہ اس ماہ کے دوران میرا اتنا وقت مہمانوں کے ساتھ صرف ہوا ہے، لہٰذا اتنی دیر کی تنخواہ میری تنخواہ سے کم کر لی جائے۔ اس طرح ہر استاد اور ہر ملازم درخواست دے کر اپنی تنخواہ کٹواتا۔ صرف مہمان کے آنے کی حد تک نہیں، بلکہ مدرسے کا وہ وقت کسی بھی ذاتی کام میں صرف ہوتا تو وہ وقت نوٹ کر کے اس کی

تنخواہ کٹواتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ وقت بکا ہوا ہے، اب یہ وقت ہمارا نہیں ہے، جس ادارے میں آپ نے ملازمت کی ہے، وہ وقت اس ادارے کی ملکیت بن گیا۔ اب اگر آپ نے اس وقت کے اندر کمی کی تو اتنے وقت کی تنخواہ آپ کے لیے حرام ہوگئی۔ آج لوگوں کا دھیان اس طرف نہیں ہے، ہم لوگ صرف سود کھانے اور رشوت لینے کو حرام سمجھتے ہیں، لیکن ان مختلف طریقوں سے ہماری آمدنیوں میں جو حرام کی آمیزش ہورہی ہے اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا۔

ٹرین کے سفر میں پیسے بچانا

یا مثلاً: آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اور جس درجے کا آپ نے ٹکٹ خریدا ہے اس سے اونچے درجے کے ڈبے میں سفر کرلیا اور دونوں درجوں کے درمیان کا کرایے کا جو فرق ہے اتنے پیسے آپ نے بچالیے، تو جو پیسے بچے وہ آپ کے لیے حرام ہوگئے اور وہ حرام مال آپ کی حلال آمدنی میں شامل ہوگیا اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلا کہ یہ حرام مال شامل ہوگیا۔

زائد سامان کا کرایہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں یہ بات مشہور ومعروف تھی کہ جب وہ ریل کا سفر کرتے تو اپنے سامان کا وزن ضرور کرایا کرتے تھے اور ایک مسافر کو جتنا سامان لے جانے کی اجازت ہوتی، اگر سامان اس وزن سے زیادہ ہوتا تو وہ زائد سامان کا کرایہ ریلوے کو ادا کرتے اور پھر سفر شروع کرتے یہ کاروائی کیے بغیر سفر کرنے کا ان کے یہاں تصور ہی نہیں تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفر

ایک مرتبہ خود حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ سفر کرنے کے لیے اسٹیشن پہنچے اور سیدھے اس دفتر میں تشریف لے گئے جہاں سامان کا وزن کرایا جاتا تھا۔ وہاں اتفاق سے ریلوے کا گارڈ کھڑا ہوا تھا جو حضرت والا کو پہچانتا تھا، وہ پوچھنے لگا کہ حضرت! کیسے تشریف لائے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں اپنے سامان کا وزن کرانے آیا ہوں تاکہ اگر زیادہ ہو تو اس کا کرایہ ادا کردوں۔ اس گارڈ نے کہا کہ حضرت! آپ وزن کرانے کے چکر میں کیوں پڑ رہے ہیں۔ آپ سامان کو وزن کرائے بغیر سفر کرلیں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور میں اس ٹرین کا گارڈ ہوں، آپ کو راستے میں کوئی پکڑے گا نہیں۔ حضرت نے اس گارڈ سے پوچھا کہ آپ کہاں تک میرے ساتھ جائیں گے؟ اس گارڈ نے جواب دیا کہ میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا۔ حضرت والا نے پوچھا اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا کہ اس کے بعد جو گارڈ آئے گا، میں اس سے کہہ دوں گا کہ ان کے سامان کا ذرا خیال رکھنا۔ حضرت والا نے پوچھا کہ پھر گارڈ کہاں تک جائے گا؟ گارڈ نے جواب دیا کہ وہ گارڈ تو جہاں تک آپ کی منزل ہے وہاں تک آپ کے ساتھ ہی سفر کرے گا۔ اس لیے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ حضرت والاؒ نے فرمایا کہ مجھے اور بھی آگے جانا ہے۔ اس نے پوچھا آگے کہاں جانا ہے؟ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے تو اس منزل سے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس جانا ہے، وہاں کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا جو مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے سوال وجواب سے بچائے گا؟

پھر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ٹرین تمہاری ملکیت نہیں ہے، اس کے

اوپر تمہارا اختیار نہیں ہے، تمہیں محکمے کی طرف سے اجازت نہیں ہے کہ تم کسی شخص کے زیادہ سامان کو کرایہ کے بغیر چھوڑ دو۔ لہٰذا میں تمہاری وجہ سے دنیاوی پکڑ سے تو بچ جاؤں گا، لیکن اس وقت جو چند پیسے میں بچالوں گا اور وہ چند پیسے میرے لیے حرام ہوجائیں گے۔ ان حرام پیسوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال ہوگا تو ہاں کون سا گارڈ مجھے بچائے گا اور کون جواب دہی کرے گا؟ یہ باتیں سن کر گارڈ کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سامان وزن کرا کر اس کے زائد پیسے ادا کر کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

یہ حرام پیسے رزقِ حلال میں شامل ہوگئے

لہٰذا اگر کسی نے اس طرح ریل گاڑی میں ہو یا ہوائی جہاز میں سفر کے دوران اجازت سے زیادہ سامان کے ساتھ سفر کرلیا اور اس سامان کا وزن کرا کر اس کا کرایہ علیحدہ سے ادا نہیں کیا تو اس کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ حرام اور یہ حرام پیسے ہمارے رزقِ حلال کے اندر شامل ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا جو اچھا خاصا حلال پیسہ تھا اس میں حرام کی آمیزش ہوگئی۔

یہ بے برکتی کیوں نہ ہو؟

آج ہم لوگ جو بے برکتی کی وجہ سے پریشان ہیں اور ہر شخص رونا رو رہا ہے، جو لکھ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے اور جو کروڑ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے کہ صاحب خرچہ نہیں پورا ہوتا اور مسائل حل نہیں ہوتے، درحقیقت یہ بے برکتی اس لیے ہے کہ حلال وحرام کی تمیز اور اس کی فکر اٹھ گئی ہے۔ بس چند مخصوص چیزوں کے بارے میں تو یہ ذہن میں بٹھالیا ہے کہ یہ حرام ہیں، ان سے تو کسی نہ کسی

طریقے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مختلف ذرائع سے جو یہ حرام پیسے ہماری آمدنیوں میں آرہے ہیں ان کی فکر نہیں۔

ٹیلی فون اور بجلی کی چوری

یا مثلاً: ٹیلی فون کے محکمے والوں سے دوستی کرلی اور اس کے ذریعے سے ملکی اور غیر ملکی کالیں ہورہی ہیں، دنیا بھر میں باتیں ہورہی ہیں اور ان کالوں پر ایک پیسہ ادا نہیں کیا جارہا ہے۔ یہ درحقیقت محکمے کی چوری ہورہی ہے اور اس چوری کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ مالِ حرام ہے اور وہ مالِ حرام ہمارے مالِ حلال کے اندر شامل ہورہا ہے۔ یا مثلاً بجلی کی چوری ہورہی ہے کہ بجلی کا میٹر بند پڑا ہے، لیکن بجلی استعمال ہورہی ہے۔ اس طرح جو پیسے بچے وہ مالِ حرام ہے اور وہ حرام مال ہمارے حلال مال کے اندر شامل ہورہا ہے اور حرام مال کی آمیزش ہورہی ہے۔ لہٰذا نہ جانے کتنے شعبے ایسے ہیں جن میں ہم نے اپنے لیے حرام کے راستے کھول رکھے ہیں اور حرام مال ہمارے حلال مال میں داخل ہورہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بے برکتی کے عذاب کے اندر مبتلا ہیں۔

حلال وحرام کی فکر پیدا کریں

لہٰذا ہر کام کرتے وقت دیکھو کہ جو کام میں کر رہا ہوں یہ حق ہے یا ناحق ہے۔ اگر انسان اس کی فکر کے ساتھ زندگی گزارلے کہ ناحق کوئی پیسہ اس کے مال کے اندر شامل نہ ہو تو یقین رکھیے پھر اگر ساری عمر نوافل نہ پڑھیں اور ذکر و تسبیحات نہ کی، لیکن اپنے آپ کو حرام سے بچا کر قبر تک لے گیا تو ان شاء اللہ سیدھا جنت میں جائے گا اور اگر حلال وحرام کی فکر تو نہیں کی مگر تہجد کی نماز بھی

پڑھ رہا ہے، اشراق کی نماز بھی پڑھ رہا ہے، ذکر و تسبیح بھی کر رہا ہے تو یہ نوافل اور یہ ذکر انسان کو حرام مال کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

یہاں تو آدمی بنائے جاتے ہیں

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ خانقاہوں میں ذکر شغل سیکھنے کے لیے جاتے ہیں، اگر ذکر و شغل سیکھنا ہے تو بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں وہاں چلا جائے، لیکن ہمارے یہاں تو آدمی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شریعت کے جو احکام ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی فکر پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر اگر کوئی ڈاڑھی والا آدمی اپنا سامان وزن کرانے کے لیے بکنگ آفس پہنچتا تو وہ دفتر والے اس کو دیکھتے ہی پہچان لیتے کہ اس کا تعلق تھانہ بھون سے ہے، لہٰذا اس سے خود پوچھ لیتے کہ آپ تھانہ بھون جا رہے ہیں؟

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اپنے تعلق والوں میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے معمولات چھوٹ گئے ہیں تو مجھے زیادہ دکھ اور شکایت نہیں ہوتی، لیکن اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے حلال و حرام کو ایک کر رکھا ہے اور اس کو معاملات میں حلال و حرام کی فکر نہیں ہے تو مجھے اس شخص سے نفرت ہو جاتی ہے۔

ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بڑے خلیفہ تھے، جن کو آپ نے باقاعدہ خلافت عطا فرمائی تھی۔ ایک مرتبہ وہ ایک سفر سے تشریف لائے تو ان کے ساتھ

ایک بچہ بھی تھا، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام دعا ہوئی، خیریت معلوم کی۔ حضرت والا نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ فلاں جگہ سے آرہا ہوں۔ حضرت نے پوچھا کہ ریل گاڑی سے آرہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ بچہ جو تمہارے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟ اب آپ اندازہ لگائیں کہ خانقاہ کے اندر پیر صاحب اپنے مرید سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بچے کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟ اور دوسری خانقاہوں میں یہ سوال کرنے کا تصور ہی نہیں ہے۔ دوسری خانقاہوں میں یہ سوال ہوتا ہے کہ معمولات پورے کیے تھے یا نہیں؟ تہجد کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ اشراق کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ لیکن یہ سوال ہو رہا ہے کہ یہ بچہ جو آپ کے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ آدھا لیا تھا یا پورا لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! آدھا لیا تھا۔ حضرت نے پھر سوال کیا اس بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ بچہ ویسے تو تیرہ سال ہے، لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے اس لیے آدھا ٹکٹ لیا تھا۔

یہ جواب سن کر حضرت والا کو بہت رنج ہوا اور ان سے خلافت واپس لے لی اور فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تم اس لائق نہیں ہو کہ تمہیں خلافت دی جائے اور تمہیں مجاز بنایا جائے، اس لیے کہ تمہیں حلال و حرام کی فکر نہیں، جب بچے کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہوگئی ہے چاہے ایک دن ہی زیادہ کیوں نہ ہوئی ہو تو اس وقت تم پر واجب تھا کہ تم بچے کا پورا ٹکٹ لیتے۔ تم نے آدھا ٹکٹ لے کر جو پیسے بچائے وہ حرام کے پیسے بچائے اور جس کو حرام سے بچنے کی فکر نہ ہو وہ خلیفہ بننے کا اہل نہیں۔ چنانچہ خلافت واپس لے لی۔

اگر کوئی شخص حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے آکر کہتا کہ حضرت معمولات ترک

ہوگئے۔ تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ معمولات ترک ہوگئے تو استغفار کرو اور دوبارہ شروع کردو اور ہمت سے کام لو اور اس بات کا دوبارہ عزم کرو کہ آئندہ ترک نہیں کریں گے اور معمولات ترک کرنے کی بنا پر کبھی خلافت واپس نہیں لی، لیکن حلال وحرام کی فکر نہ کرنے پر خلافت واپس لے لی۔ اس لیے کہ جب حلال وحرام کی فکر نہ ہوتو وہ انسان انسان نہیں۔ اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"طلب کسب الحلال فریضة بعدالفریضة"

حلال کی طلب دوسرے فرائض کے بعد یہ بھی فرض ہے۔

حرام مال حلال مال کو بھی تباہ کردیتا ہے

لہٰذا ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کہ جو پیسے اس کے پاس آرہے ہیں اور جو کام وہ کررہا ہے، ان میں کہیں حرام مال کی آمیزش تو نہیں ہے۔ حرام مال کی آمیزش کی چند مثالیں میں نے آپ کو سمجھانے کے لیے پیش کردیں۔ ورنہ نہ جانے کتنے کام ایسے ہیں جن کے ذریعے نادانستہ طور پر اور غیر شعوری طور پر ہمارے حلال مال میں حرام کی آمیزش ہوجاتی ہے، اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ جب کبھی کسی حلال مال کے ساتھ حرام مال لگ جاتا ہے تو حرام مال حلال مال کو بھی تباہ کرکے چھوڑتا ہے، یعنی اس حرام مال کے شامل ہونے کے نتیجے میں حلال مال کی برکت، آدمی کا سکون اور راحت تباہ ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہر شخص اس کی فکر کرے اور ہر شخص اپنے ایک ایک عمل کا جائزہ لے اور اپنی آمدنی کا جائزہ لے کہ ہمارے حلال مال میں کوئی حرام مال تو شامل نہیں ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس فکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

رزق کی طلب مقصودِ زندگی نہیں

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس حدیث نے جہاں ایک طرف رزقِ حلال کی اہمیت بتائی کہ رزقِ حلال کی طلب دین سے خارج کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ بھی دین کا ایک حصہ ہے، وہاں اس حدیث نے ہمیں رزق حلال کی طلب کا درجہ بھی بتادیا کہ اس کا کتنا درجہ اور کتنی اہمیت ہے۔ آج کی دنیا نے معاش کو، معیشت کو اور روپے پیسے کمانے کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرار دے رکھا ہے، آج ہماری ساری دوڑ دھوپ اسی کے گرد گھوم رہی ہے کہ پیسہ کس طرح حاصل ہو۔ کس طرح پیسوں میں اضافہ کیا جائے اور کس طرح اپنی معیشت کو ترقی دی جائے اور اسی کو ہم نے اپنی زندگی کی آخری منزل قرار دے رکھا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں بتادیا کہ رزقِ حلال کی طلب فریضہ تو ہے، لیکن دوسرے فرائض کے بعد اس کا درجہ آتا ہے، یہ انسان کی زندگی کا مقصدِ اصلی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ضرورت ہے اور اس ضرورت کے تحت انسان کو نہ صرف یہ کہ رزقِ حلال کے طلب کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید کی گئی ہے کہ تم رزقِ حلال طلب کرو، لیکن یہ رزق حلال کی طلب تمہارا مقصدِ زندگی نہیں ہے، بلکہ مقصدِ زندگی کچھ اور ہے اور وہ اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی اور عبادت کرنا ہے۔ یہ انسان کا اصل مقصدِ زندگی ہے اور معیشت کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

رزق کی طلب میں فرائض کا ترک جائز نہیں

لہٰذا جس جگہ پر معیشت میں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے عائدکردہ فرائض

کے درمیان ٹکراؤ ہو۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ترجیح ہوگی۔ بعض لوگ افراط کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں، جب انہوں نے یہ سنا کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے تو اس کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس طلبِ حلال کے نتیجے میں اگر نمازیں ضائع ہورہی ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، روزے چھوٹ رہے ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، حلال وحرام ایک ہورہا ہے تو ان کو اس کی پرواہ نہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں یہ بھی تو دین کا ایک حصہ ہے، ہمارے دین میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے لہٰذا جو کام ہم کر رہے ہیں یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا استدلال

کچھ عرصے پہلے ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں وہ مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے اور جب مطب بند کر کے گھر واپس آتے ہیں تو گھر آکر تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ نماز کو قضا کردیتے ہیں یہ اچھا نہیں ہے، آپ وقت پر نماز پڑھ لیا کریں، تو جواب میں شوہر کہتے ہیں کہ اسلام نے خدمتِ خلق سکھائی ہے اور یہ ڈاکٹری اور مطب جو کر رہے ہیں یہ بھی خدمت خلق کر رہے ہیں اور یہ بھی دین کا حصہ ہے، اب اگر ہم نے خدمتِ خلق کی خاطر نماز کو چھوڑ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اب دیکھیے! حلال کمانے کے لیے انہوں نے اوّلین دینی فریضے کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ

"طلب کسب الحلال فريضة بعد الفريضة"

یہ فریضہ تو ہے، لیکن بعد الفرائض ہے۔ لہٰذا اگر کسب معاش کے فریضے میں اور اوّلین دینی فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہوجائے تو اس وقت دینی فریضہ غالب رہے گا۔

ایک لوہار کا قصہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ سے یہ واقعہ سنا کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ بڑے اونچے درجے کے ولی اللہ، فقیہ اور محدث و اصولی تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے درجات عطا فرمائے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ جواب میں حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم فرمایا ہے اور بہت کچھ نوازشیں فرمائیں، لیکن میرے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا۔ اس لوہار کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بخشا وہ ہمیں نصیب نہ ہوسکا۔ جب اس شخص کی آنکھ کھلی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ پتہ کرنا چاہیے کہ وہ کون لوہار تھا اور وہ کیا عمل کرتا تھا کہ اس کا درجہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ شخص حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے محلّے میں گیا اور معلومات کیں تو پتہ چلا کہ واقعتاً ان کے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا۔ اور اس کا انتقال ہوچکا ہے۔ اس کے گھر جاکر اس کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو لوہار تھا اور سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ اس کا کوئی خاص عمل اور خاص نیکی بتاؤ جو وہ کیا کرتا تھا، اس لیے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس کا مقام ہم سے بھی آگے بڑھ گیا۔

تہجد نہ پڑھنے کی حسرت

اس کی بیوی نے کہا کہ وہ سارا دن تو لوہا کوٹتا رہتا تھا، لیکن ایک بات اس کے اندر یہ تھی کہ چونکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے، رات کو جس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے گھر کی چھت پر اس طرح کھڑے ہوجاتے جس طرح کوئی لکڑی کھڑی ہوتی ہے اور کوئی حرکت نہیں کرتے تھے۔ جب میرا شوہر ان کو دیکھتا تو یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراغت عطا فرمائی ہوئی ہے۔ یہ ساری رات کیسی عبادت کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ اگر ہمیں بھی اپنے مشغلے سے فراغت نصیب ہوتی، تو ہمیں بھی اس طرح تہجد پڑھنے کی توفیق ہوجاتی۔ چنانچہ وہ حسرت کیا کرتا تھا کہ میں چونکہ دن بھر لوہا کوٹتا ہوں، پھر رات کو تھک کر سوجاتا ہوں۔ اس لیے اس طرح تہجد پڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔

نماز کے وقت کام بند

دوسری بات اس کے اندر یہ تھی کہ جب وہ لوہا کوٹ رہا ہوتا تھا اور اس وقت اس کے کان میں اذان کی آواز ''اللہ اکبر'' آجاتی، تو اگر اس وقت اس نے اپنا ہتھوڑا سر سے اونچا ہاتھ میں اٹھایا ہوا ہوتا تو اس وقت یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے ایک مرتبہ اور لوہے پر ماردے، بلکہ ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اب اذان کی آواز سننے کے بعد اس ہتھوڑے سے ضرب لگانا میرے لیے درست نہیں، پھر نماز کے لیے مسجد کی طرف چلا جاتا تھا۔ جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا اس نے یہ باتیں سن کر کہا

کہ بس یہی وجہ ہے جس نے ان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان پر رشک آرہا ہے۔

ٹکراؤ کے وقت یہ فریضہ چھوڑ دو

آپ نے دیکھا کہ وہ لوہار جو لوہا کوٹنے کا کام کر رہا تھا، یہ بھی کسبِ حلال کا فریضہ تھا۔ جب اذان کی آواز آئی تو وہ اوّلین فریضے کی پکار تھی، جس وقت دونوں میں ٹکراؤ ہوا تو اس نے اللہ والے اور اوّلین فریضے کو ترجیح دی اور دوسرے فریضے کو چھوڑ دیا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بلند مقام عطا فرما دیا۔ لہٰذا جہاں ٹکراؤ ہو جائے، وہاں اوّلین فریضے کو اختیار کر لو اور کسبِ حلال کے فریضے کو چھوڑ دو۔

ایک جامع دعا

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا فرمائی

"اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا"[1]

اے اللہ! ہمارا سب سے بڑا غم دنیا کو نہ بنائیے کہ ہمارے دماغ پر سب سے بڑا غم دنیا کا مسلط ہو کہ پیسے کہاں سے آئیں بنگلہ کیسے بن جائے اور کار کیسے حاصل ہو جائے اور اے اللہ! ہمارے سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنائیے کہ جو کچھ

(۱) سنن الترمذی ٥/٤٨١ (٣٥٠٢) وقال هذا حديث حسن غريب۔ وامالی الشجری ١/٣١٥ (١٠٩٩) طبع دار الکتب العلمیة۔ بیروت۔

علم ہے وہ بس دنیا کا علم ہے اور اے اللہ! نہ ہماری رغبت کی انتہا دنیا کو بنایئے کہ جو کچھ دل میں رغبت پیدا ہو وہ دنیا ہی کی ہو اور آخرت کی رغبت پیدا نہ ہو۔

خلاصہ اور تین سبق

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تین سبق معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ طلبِ حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان طلبِ حلال کی کرے اور حرام سے بچنے کی فکر کرے اور تیسرا انسان معیشت کی سرگرمی کو صحیح مقام پر رکھے اور اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے۔ اس لیے کہ اوّلین فرائض دینیہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حلال روزگار نہ چھوڑیں

(اصلاحی خطبات ۶/۱۳۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حلال روزگار نہ چھوڑیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

قال رسول اللہ ﷺ: «من رزق فی شیء فلیلزمہ»[1]

(۱) شعب الایمان ۲/۴۴۲ (۱۱۸۴) طبع الرشد۔الریاض۔ومثلہ فی سنن ابن ماجہ ۳/۵۱۵ (۲۱۴۷-۲۱۴۸) وقال البوصیری فی "مصباح الزجاجة" (۳/۸): هذا إسناد ضعيف، فروة بن يونس أبو يونس مختلف فيه، قاله الذهبي في الكاشف، وقال الأزدي: ضعيف، وذكره ابن حبان في "الثقات"، وهلال بن جبير البصري قال ابن حبان في "الثقات": روى عن أنس بن مالك إن كان سمع منه. وقال المناوی فی "فیض القدیر" (۶/۱۳۶): قال الحافظ العراقي: بسند حسن۔

”ومن جعلت معیشته فی شیء فلا ینتقل عنه
حتی یتغیر علیه“(۱).

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

جس شخص کو جس کام کے ذریعے رزق مل رہا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس کام میں لگا رہے، اپنے اختیار اور مرضی سے بلاوجہ اس کو نہ چھوڑے۔

اور جس شخص کا روزگار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے ساتھ وابستہ کردیا گیا ہو تو وہ شخص اس روزگار کو چھوڑ کر دوسری طرف منتقل نہ ہو، جب تک کہ وہ روزگار خود سے بدل جائے یا اس روزگار میں خود سے ناموافقت پیدا ہو جائے۔

رزق کا ذریعہ منجانب اللہ ہے

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی شخص کے لیے حصولِ رزق کا ایک ذریعہ مقرر فرمادیا، وہ شخص اس میں لگا ہوا ہے اور اس کے ذریعے اس کو رزق مل رہا ہے تو اب بلاوجہ اس روزگار کو چھوڑ کر الگ نہ ہو، تاوقتیکہ وہ خود اس کے ہاتھ سے نکل جائے یا ایسی ناموافقت پیدا ہوجائے کہ اب آئندہ اس کو جاری رکھنا پریشانی کا سبب ہوگا، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعہ سے رزق وابستہ کردیا ہے تو یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اس

(۱) اتحاف السادة المتقین للزبیدی ۲۸۷/٤ طبع موسسة التاریخ العربی۔ وأصله فی سنن ابن ماجه ۷۲۷/۲ (۲۱٤۸) نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علامہ سخاوی رحمہ اللہ کی کتاب ”المقاصد الحسنة“ ص۳۹۷ (۱۰٦۰) طبع دار الکتب العلمیة۔ از مرتب عفی عنہ

کام میں لگایا گیا ہے اور اس سے وابستہ کیا گیا ہے، کیونکہ ویسے تو رزق کے حصول کے ہزاروں راستے اور طریقے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے لیے کسی خاص طریقے کو رزق حاصل کرنے کا سبب بنا دیا تو یہ منجانب اللہ ہے، اب اس منجانب اللہ طریقے کو اپنی طرف سے بلاوجہ نہ چھوڑے۔

روزگار اور معیشت کا نظام خداوندی

دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں روزگار اور معیشت کا ایک عجیب نظام بنایا ہے جس کو ہماری عقل نہیں پہنچ سکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا[1]

یعنی ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کی ہے، وہ اس طرح کہ کسی انسان کے دل میں حاجت پیدا کی اور دوسرے انسان کے دل میں اس حاجت کو پورا کرنے کا طریقہ ڈال دیا، ذرا غور کریں کہ انسان کی حاجتیں اور ضرورتیں کتنی ہیں؟ روٹی کی اسے ضرورت ہے، کپڑے کی اسے ضرورت ہے، مکان کی اسے ضرورت ہے، گھر کا سازوسامان اور برتنوں کی اسے ضرورت ہے، گویا کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لیے بے شمار اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا پوری دنیا کے انسانوں نے مل کر کوئی کانفرنس کی تھی اور اس کانفرنس میں انسان کو پیش آنے والی ضروریات کو شمار کیا تھا اور پھر آپس میں فیصلہ کیا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا بنائیں، اتنے انسان برتن بنائیں، اتنے انسان جوتے بنائیں، اتنے انسان گندم پیدا کریں اور اتنے انسان چاول پیدا کریں

---

(۱) سورۃ الزخرف آیت (۳۲)۔

وغیرہ، اگر تمام انسان مل کر کانفرنس کر کے یہ طے کرنا چاہتے تب بھی یہ انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا احاطہ کرلیں اور پھر آپس میں تقسیمِ کار بھی کریں کہ تم یہ کام کرنا، تم فلاں چیز کی دکان کرنا اور تم فلاں چیز کی دکان کرنا، یہ تو اللہ کا قائم کیا ہوا نظام ہے کہ اس نے ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گندم اگاؤ، دوسرے انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم آٹے کی چکی لگاؤ، ایک کے دل میں یہ ڈال دیا کہ چاول پیدا کرو، ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گھی کی دکان لگاؤ، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے دل میں ان حاجات کو ڈال دیا جو تمام انسانوں کی حاجتیں ہیں، چنانچہ جب آپ کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہیں اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ کے پاس پیسے بھی ہوں تو بازار میں آپ کی وہ حاجت ان شاء اللہ ضرور پوری ہوجائے گی۔

تقسیمِ رزق کا حیرت ناک واقعہ

میرے بڑے بھائی جناب زکی کیفی صاحب، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے، ایک دن انہوں نے فرمایا کہ تجارت میں بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے ایسے مناظر دکھاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رزاقیت کے آگے سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی دکان ''ادارۂ اسلامیات'' کے نام سے ہے، وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ فرمایا کہ ایک دن جب میں نے صبح کو گھر سے دکان جانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ شدید بارش شروع ہوگئی، اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ایسی شدید بارش ہورہی ہے، اس وقت سارا نظامِ زندگی تلپٹ ہے، ایسے میں دکان جاکر کیا کروں گا؟ کتاب خریدنے کے لیے کون دکان پر آئے

گا؟ اس لیے کہ ایسے وقت میں اول تو لوگ گھر سے باہر نہیں نکلتے، اگر نکلتے بھی ہیں تو شدید ضرورت کے لیے نکلتے ہیں، کتاب اور خاص طور پر دینی کتاب تو ایسی چیز ہے کہ جس سے نہ تو بھوک مٹ سکتی ہے، نہ کوئی دوسری ضرورت پوری ہوسکتی ہے اور جب انسان کی دنیاوی تمام ضروریات پوری ہوجائیں تو اس کے بعد کتاب کا خیال آتا ہے، لہٰذا ایسے میں کون گاہک کتاب خریدنے آئے گا؟ اور میں دکان پر جا کر کیا کروں گا؟

لیکن ساتھ ہی دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے تو اپنے روزگار کے لیے ایک طریقہ اختیار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کو میرے لیے رزق کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا ہے، اس لیے میرا کام یہ ہے کہ میں جا کر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، چاہے کوئی گاہک آئے یا نہ آئے۔ بس میں نے چھتری اٹھائی اور دکان کی طرف روانہ ہوگیا، جا کر دکان کھولی اور قرآن شریف کی تلاوت شروع کردی، اس خیال سے کہ گاہک تو کوئی آئے گا نہیں، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ لوگ اپنے اوپر برساتی ڈال کر آرہے ہیں اور کتابیں خرید رہے ہیں کہ جن کو بظاہر وقتی ضرورت بھی نظر نہیں آرہی تھی، وہ بھی کتابیں خرید رہے ہیں، چنانچہ جتنی بکری اور دنوں میں ہوتی تھی تقریباً اتنی ہی بکری اس بارش میں بھی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! اگر کوئی انسان عقل سے سوچے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس آندھی اور طوفان والی تیز بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ جا کر کتاب خریدیں اور میرے دل میں یہ ڈالا کہ تم جا کر دوکان کھولو، مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور ان کو کتاب کی ضرورت تھی اور دونوں کو دوکان پر جمع کردیا، ان کو کتاب مل گئی، مجھے پیسے مل گئے، یہ نظام صرف اللہ تعالیٰ بنا سکتے ہیں، کوئی شخص یہ چاہے کہ میں

منصوبے کے ذریعے اور کانفرنس کر کے یہ نظام بنا لوں؟ باہمی منصوبہ بندی کر کے بنالوں تو کبھی ساری عمر نہیں بنا سکتا۔

رات کو سونے اور دن میں کام کرنے کا فطری کام

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا سی بات میں غور کرو کہ سارے انسان رات کے وقت سوتے ہیں اور دن کے وقت کام کرتے ہیں اور رات کے وقت نیند آتی ہے اور دن کے وقت نیند بھی نہیں آتی، تو کیا ساری دنیا کے انسانوں نے مل کر کوئی انٹرنیشنل کانفرنس کی تھی جس میں سب انسانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دن کے وقت کام کریں گے اور رات کے وقت سویا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ رات کے وقت سوجاؤ اور دن کے وقت کام کرو

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿١١﴾ (١)

اگر یہ چیز انسان کے اختیار میں دے دی جاتی کہ وہ جب چاہے کام کرے اور جس وقت چاہے سوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی شخص کہتا کہ میں دن کو سوؤں گا اور رات کو کام کروں گا، کوئی کہتا کہ میں صبح کے وقت سوؤں گا اور شام کے وقت کام کروں گا، پھر اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک وقت میں ایک شخص سونا چاہ رہا ہے اور دوسرا شخص اسی وقت میں کھٹ کھٹ کر رہا ہے اور اپنا کام کر رہا ہے، اس کی وجہ سے دوسرے کی نیند خراب ہوتی، اس طرح دنیا کا نظام خراب ہوتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اس نے ہر انسان کے دل میں یہ

---

(۱) سورۃ النبأ آیت (۱۰-۱۱)۔

بات ڈال دی کہ دن کے وقت کام کرو اور رات کے وقت آرام کرو اور اس کو فطرت کا ایک تقاضہ بنادیا۔

رزق کا دروازہ بند مت کرو

بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی معیشت کا نظام بھی خود بنایا ہے اور ہر ایک کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم یہ کام کرو اور تم یہ کام کرو، لہٰذا جب تم کو کسی کام پر لگا دیا گیا اور تمہارا رزق ایک ذریعے سے وابستہ کر دیا گیا تو یہ کام خود سے نہیں ہوگیا، بلکہ کسی کرنے والے نے کیا اور کسی مصلحت سے کیا، لہٰذا اب بلاوجہ اس حلال ذریعہ رزق کو چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ اختیار کرنے کی فکر مت کرو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اسی ذریعے میں کوئی مصلحت رکھی ہو اور تمہارے اس کام میں لگنے کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں کے کام نکل رہے ہوں اور تم اس وقت پورے نظام معیشت کا ایک حصہ اور پرزہ بنے ہوئے ہو، اس لیے اپنی طرف سے اس ذریعے کو مت چھوڑو، البتہ اگر کسی وجہ سے وہ ملازمت یا وہ تجارت خود ہی چھوٹ جائے یا اس کے اندر ناموافقت پیدا ہوجائے مثلاً: دکان پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے اور کوشش کے باوجود آمدنی بالکل نہیں ہورہی ہے تو اس صورت میں بے شک اس ذریعے کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ اختیار کرلے، لیکن جب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو اس وقت تک خود سے رزق کا دروازہ بند نہ کرے۔

یہ عطاءِ خداوندی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا است
اورا تو رد مکن کہ فرستادہ خدا است

یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز طلب کے بغیر مل جائے تو اس کو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو رد نہ کرو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے، بہرحال، اللہ تعالیٰ نے جس ذریعہ سے تمہارا رزق وابستہ کیا ہے اس سے لگے رہو جب تک کہ خود ہی حالات نہ بدل جائیں۔

ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اس حدیث کے تحت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

> ''اہلِ طریق نے اسی پر تمام معاملات کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے ساتھ واقع ہوتے ہیں قیاس کیا ہے، جن کی معرفت، بصیرت اور فراست خصوصاً واقعات سے ہوجاتی ہے، اس معرفت کے بعد وہ ان میں تغیر اور تبدل از خود نہیں کرتے اور یہ امر قوم کے نزدیک مثل بدیہیات کے، بلکہ مثل محسوسات کے ہے جس کی وہ اپنے احوال میں رعایت رکھتے ہیں''۔

مطلب یہ کہ اس حدیث میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ اگرچہ براہِ راست رزق سے متعلق ہے، لیکن صوفیاءِ کرام اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کے ساتھ جو بھی معاملہ کر رکھا ہے مثلاً: علم میں، خلقِ خدا کے ساتھ تعلقات میں یا کسی اور چیز میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ

کر رکھا ہے تو وہ شخص اس کو اپنی طرف سے بدلنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس پر قائم رہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خلافت کیوں نہیں چھوڑی؟

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خلافت کے آخری دور میں ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا اور اس کی وجہ بھی خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے اور تم اپنے اختیار سے اس قمیص کو مت اتارنا[1]، لہٰذا یہ خلافت جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خلافت کی قمیص پہنائی ہے، میں اپنے اختیار سے اس کو نہیں اتاروں گا، چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور نہ ان کو قلع قمع کرنے کا حکم دیا، حالانکہ آپ امیر المؤمنین اور خلیفہ وقت تھے، آپ کے پاس لشکر اور فوج تھی، آپ چاہتے تو باغیوں کے خلاف مقابلہ کرسکتے تھے، لیکن آپ نے فرمایا کہ چونکہ یہ باغی اور مجھ پر حملہ کرنے والے بھی مسلمان ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے والا پہلا شخص میں ہوجاؤں، چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کا مقابلہ کیا، بلکہ اپنے گھر کے اندر ہی محصور ہو کر بیٹھ گئے، حتیٰ کہ اپنی جان قربان کردی اور جامِ شہادت نوش فرمایا، شہادت قبول کرلی، لیکن خلافت نہیں چھوڑی، وہی بات ہے جس کی طرف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذمے ایک کام سپرد کردیا تو اس میں لگے رہو، اپنی طرف سے اس کو مت چھوڑو۔

---

[1] سنن الترمذی ۷۳/۶ (۳۷۰۵) وقال ھذا حدیث حسن غریب۔

خدمتِ خلق کا منصب عطاءِ خداوندی ہے

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے جب خدمتِ دین کا کوئی راستہ تمہارے لیے تجویز فرمادیا اور وہ تمہاری طلب کے بغیر ملا ہے تو اب بلاوجہ اس کو ترک نہ کرے، اس کے لیے اسی میں نور اور برکت ہے، اسی طرح اہلِ طریق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جتنے احوال اور معاملات ہوتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان احوال کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر قبول کریں۔ اسی طرح بعض اوقات کسی شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہوتا ہے مثلاً: ایک شخص کی طرف لوگ اپنی مدد اور اس کے تعاون کے لیے رجوع کرتے ہیں یا دین کے معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں یا دنیاوی معاملات میں اس سے مشورہ لینے کے لیے رجوع کرتے ہیں، تو حقیقت میں یہ ایک ایسا منصب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ آپس کے معاملات میں اس شخص سے مشورہ کرو یا ضرورت کے موقع پر اس شخص سے مدد لو اور جھگڑے ہوں تو اس شخص سے جا کر فیصلہ کراؤ، لوگوں کے دلوں میں یہ بات از خود پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ باتیں ڈال دیں، تو یہ منصب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے، اب اپنی طرف سے اس کو ختم نہ کرے، اس لیے کہ یہ منجانب اللہ ہے اور اس خدمتِ خلق کو منجانب اللہ سمجھ کر کرتا رہے۔

مثلاً: بعض اوقات اللہ تعالیٰ خاندان میں سے کسی شخص کو یہ مقام اور منصب عطا فرمادیتے ہیں کہ جہاں خاندان میں کوئی جھگڑا ہو یا کوئی اہم معاملہ کرنا ہے تو لوگ فوراً اس شخص کے پاس جاتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں، اب بعض اوقات وہ شخص اس بات سے گھبراتا ہے کہ دنیا کی ساری باتیں اور سارے

جھگڑے میرے سر ڈالے جاتے ہیں، حقیقت میں یہ گھبرانے کی چیز نہیں ہے اس لیے کہ یہ منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں ڈالا گیا ہے کہ اس کی طرف رجوع کرو اور یہ منصب منجانب اللہ عطا ہوا ہے۔

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

لہٰذا اس منصب سے بے نیازی مت برتو، بلکہ اس کو خوشی سے قبول کرلو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ خدمت سونپی گئی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھیے کہ ایک مرتبہ آپ غسل فرمارہے تھے، غسل کے دوران آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہوگئیں، چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا اور تتلیاں جمع کرنی شروع کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے ایوب (علیہ السلام) کیا ہم نے تم کو غنی نہیں کیا اور تمہیں مال ودولت نہیں دی؟ پھر بھی تم اس سونے کو جمع کرنے کی طرف دوڑ رہے ہو؟ جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا کہ یا اللہ! بے شک آپ نے اتنا مال ودولت عطا فرمایا ہے کہ میں اس کا شکر ادا نہیں کرسکتا، لیکن جو دولت آپ اپنی طرف سے میری طلب کے بغیر عطا فرمارہے ہیں اس سے میں کبھی بے نیازی کا اظہار نہیں کرسکتا، آپ میرے اوپر سونے کی تتلیاں برسا رہے ہیں اور میں یہ کہہ دوں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، جب آپ دے رہے ہیں تو میرا کام یہ ہے کہ میں محتاج بن کر ان کی طرف جاؤں اور ان کو حاصل کروں۔[1]

---

(۱) صحیح البخاری ۱/۶۷ (۲۷۹)۔

بات دراصل یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی نظر میں وہ تتلیاں مقصود نہیں تھیں اور نہ وہ سونا مقصود تھا جو آسمان سے گر رہا تھا، بلکہ ان کی نظر اس دینے والی ذات پر تھی کس ہاتھ سے یہ دولت مل رہی ہے اور جب دینے والی ذات اتنی عظیم ہو تو انسان کو آگے بڑھ کر اور محتاج بن کر لینا چاہیے ورنہ اس سونے کی طلب نہیں تھی۔

عیدی زیادہ طلب کرنے کا واقعہ

اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سب اولادوں کو عید کے موقع پر عیدی دیا کرتے تھے، ہم سب بھائی ہر سال عید کے موقع پر جا کر ان سے مطالبہ کیا کرتے تھے کہ پچھلی عید پر آپ نے بیس روپے دیے تھے، اس سال گرانی میں اضافہ ہوگیا ہے لہٰذا اس سال پچیس روپے دیجیے، تو ہر سال بڑھا کر مانگتے، جواب میں والد صاحب فرماتے کہ تم چور ڈاکو لوگ ہو، اور ہر سال تم زیادہ مانگتے ہو، دیکھیے اس وقت ہم سب بھائی برسرِ روزگار اور ہزاروں کمانے والے تھے، لیکن جب باپ کے پاس جاتے تو رغبت کا اظہار کر کے ان سے مانگتے، کیوں؟ بات درحقیقت یہ تھی کہ نظر ان پیسوں کی طرف نہیں تھی جو بیس، پچیس اور تیس روپے کی شکل میں مل رہے تھے، بلکہ نظر اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی کہ اس ہاتھ سے جو کچھ ملے گا اس میں جو برکت اور نور ہوگا، ہزاروں اور لاکھوں میں وہ برکت اور نور حاصل نہیں ہوسکتا، جب دنیا کے معمولی تعلقات میں انسان کا یہ حال ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں، ان کے ساتھ تعلق میں کیا حال ہوگا؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ سے مانگے تو محتاج بن کر مانگے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو تو محتاج

بن کر اس کو لے لے، اس وقت بے نیازی اختیار نہ کرے ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین

خاک برفرق قناعت بعد ازیں

جب وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ میں ان کے سامنے طمع ظاہر کروں تو ایسے میں قناعت کے سر پر خاک، اس وقت تو اس میں لذت اور مزہ ہے کہ آدمی لالچی بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر مانگے اور جو ملے اس کو قبول کر لے۔

لہٰذا جس کام پر اللہ تعالیٰ نے لگا دیا یا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا یہ ان کی طرف سے عطا ہے، اس کو اپنی طرف سے مت چھوڑو، ہاں اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن کی وجہ سے آدمی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے یا کوئی اپنا بڑا کہہ دے مثلاً: چھوڑنے کے لیے کسی بڑے سے مشورہ کیا اور اس نے یہ کہہ دیا کہ اب تمہارے لیے اس کو چھوڑ دینا ہی مناسب ہے تو اس وقت اس کو چھوڑ دو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خاص طلب کے بغیر جو چیز ملے وہ منجانب اللہ ہے، اس کی ناقدری مت کرو ؎

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا است

اورا تو رد مکن کہ فرستادہ خدا است

وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے اس کو رد مت کرو۔ اللہ تعالیٰ بچائے! بعض اوقات اس رد کرنے اور بے نیازی کا اظہار کرنے سے انجام بہت

خراب ہوجاتا ہے، العیاذ باللہ، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آجاتا ہے، لہٰذا جو چیز طلب کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے یا ایسے خدا ساز اسباب کے ذریعے یعنی ایسے اسباب کے ذریعے کوئی چیز مل گئی جس کا پہلے وہم وگمان بھی نہ تھا، بشرطیکہ وہ حلال اور جائز ہوتو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو قبول کرلینا چاہیے۔ اسی طرح جس خدمت پر اللہ تعالیٰ کسی کو لگادے تو اس کو اس خدمت پر لگا رہنا چاہیے، اس خدمت سے اپنے طور پر دست بردار ہونے کی کوشش نہ کرے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس خدمت پر لگادیا ہے اور تم سے وہ خدمت لے رہے ہیں۔ اسی طرح اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری طلب کے بغیر کوئی مقام اور منصب عطا فرمادیا مثلاً اللہ تعالیٰ نے تمہیں سردار بنادیا اور لوگ تمہیں اپنا قائد سمجھتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ایک خدمت تمہارے ذمے سپرد کی ہے، تمہیں اس خدمت کا حق ادا کرنا چاہیے، لیکن اپنے بارے میں یہ خیال کرو کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں نہ تو قائد بننے کے لائق ہوں اور نہ سردار بننے کے لائق ہوں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت پر لگا دیا ہے اس لیے اس خدمت پر لگا ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا صحیح فہم عطا فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

واٰخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

محنت اور مزدوری احادیث کی روشنی میں
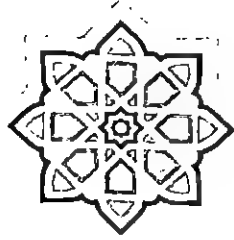
(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محنت اور مزدوری احادیث کی روشنی میں

① حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"کسی شخص نے کوئی کھانا اس کھانے سے بہتر نہیں کھایا جو خود اپنے ہاتھ سے محنت کر کے حاصل ہوا ہو اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتے تھے"۔ [1]

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص لکڑیوں کا ایک گٹھہ پشت پر لادے اور اسے فروخت کر کے روزی کمائے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ کسی کے سامنے سوال کرتا پھرے، کوئی دے، کوئی نہ دے"۔ [2]

---

(۱) صحیح البخاری ۳/۵۷(۲۰۷۲)۔
(۲) صحیح البخاری ۳/۵۷(۲۰۷٤)۔

③ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہنر مند مؤمن کو پسند کرتا ہے"۔ (۱)

④ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اپنے ہاتھ سے محنت کر کے شام کو تھکا ماندہ واپس آیا ہو اس کی شام اس حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے گناہ (صغیرہ) بخش دیے جاتے ہیں"۔ (۲)

⑤ حضرت ابو بردۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی کون سی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کا اپنے ہاتھ سے عمل کرنا اور ہر وہ کمائی جو نیکی کے ساتھ ہو"۔ (۳)

---

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۲/٤٤١ (۱۱۸۱) والمعجم الاوسط ۸/۳۸۰ (۸۹۳٤) قال الهيثمي في "المجمع" ٤/۱۰٦ (٦۲۳۱): رواه الطبراني في الكبير والأوسط، وفيه عاصم بن عبيد الله، وهو ضعيف.

(۲) المعجم الاوسط ۷/۲۸۹ (٤٥۲۰) وقال الهيثمي في "المجمع" ٤/۱۰۸ (٦۲۳۸): رواه الطبراني في الأوسط، وفيه جماعة لم أعرفهم.

(۳) مسند احمد ۲٥/۱٥۷ (۱٥۸۳٦) وقال الهيثمي فى "المجمع" ٤/۱۰۱ (٦۲۱۰): رواه أحمد، والبزار، والطبراني في الكبير، والأوسط، وفيه المسعودي وهو ثقة، ولكنه اختلط، وبقية رجاله أحمد رجال الصحيح.

⑥ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو“۔(۱)

⑦ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ میں قیامت کے دن ان کا مدمقابل حریف ہوں گا اور جس شخص کا میں حریف ہوں اسے (بدترین) شکست دے کر چھوڑتا ہوں، ایک وہ شخص جسے میرے واسطے سے (میری قسم دے کر) کوئی چیز (امانتاً) دی گئی پھر اس نے عہد شکنی کی، دوسرا وہ شخص جس نے کسی مزدور کو اجرت پر لیا اس سے محنت پوری لے لی اور اس کی اجرت ادا نہیں کی، تیسرا وہ شخص جو کسی آزاد کو بیچ کر اس کی قیمت کھالے“۔(۲)

---

(۱) سنن ابن ماجه ۹۳/۷ (۲٤٤۳) وقال البوصیری فی "مصباح الزجاجة" (۷۵/۳): هذا إسناد ضعيف، وهب بن سعيد هو عبد الوهاب بن سعيد، وعبد الرحمن بن زيد، وهما ضعيفان، لكن نقل عبد العظيم المنذري الحافظ في "كتاب الترغيب": إن عبد الرحمن بن زيد وثق، وقال: قال ابن عدي: أحاديثه حسان، قال: وهو ممن احتمله الناس، وصدقه بعضهم، وهو ممن يكتب حديثه، قال: ووهب ابن سعيد وثقه ابن حبان وغيره انتهى، فعلى هذا يكون الإسناد حسنا والله أعلم، وأصله في "صحيح البخاري" وغيره من حديث أبي هريرة، لكن إسناد المصنف ضعيف.

(۲) صحیح البخاری ۸۲/۳ (۲۲۲۷)۔
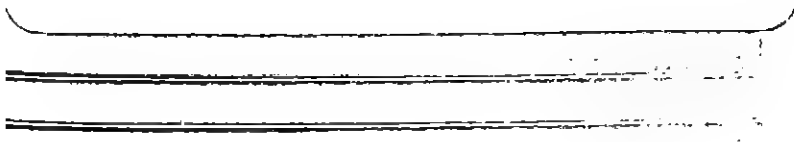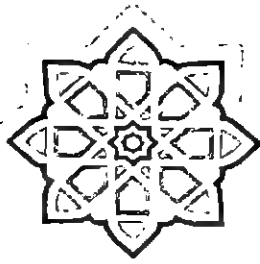
معاملات دین کا اہم شعبہ

(انعام الباری ۶/ ۴۱ کتاب البیوع)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معاملات دین کا اہم شعبہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا محمد النبي الامي وعلى آله وصحبه أجمعين وعلى من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔ اما بعد!

دین کا ایک اہم شعبہ ''معاملات''

کتاب البیوع [1] سے دین کا ایک شعبہ معاملات کا شعبہ شروع ہو رہا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند اصولی باتیں پہلے ذکر کردی جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ معاملات دین کا ایک بہت ہی اہم شعبہ ہے اور جیسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادات کا مکلف بنایا ہے اسی طرح معاملات میں بھی کچھ احکام کا مکلف بنایا ہے اور جس طرح ہمیں عبادات میں رہنمائی عطا فرمائی ہے

(۱) صحیح البخاری ۵۲/۳۔

اسی طرح معاملات میں بھی رہنمائی عطا فرمائی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کے وقت کن باتوں کا خیال رکھیں، کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی چیزیں حرام ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں کے درمیان معاملات سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی اہمیت دلوں سے مٹ گئی ہے، دین صرف عقائد اور عبادات کا نام رکھ دیا ہے، معاملات کی صفائی، معاملات میں جائز وناجائز کی فکر اور حلال وحرام کی فکر رفتہ رفتہ ختم ہوگئی ہے، اس لیے بھی اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان کے بارے میں غفلت بڑھتی جارہی ہے۔

معاملات کے میدان میں دین سے دوری کی وجہ

اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ چند سو سالوں سے مسلمانوں پر غیر ملکی اور غیر مسلم سیاسی اقتدار مسلط رہا اور اس غیر مسلم سیاسی اقتدار نے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ اس بات کی تو اجازت دی کہ وہ اپنے عقائد پر قائم رہیں اور مسجدوں میں عبادات انجام دیتے رہیں، اپنی انفرادی زندگی میں عبادات کا اہتمام کریں، لیکن زندگی میں تجارت(Business) ومعیشت(Economy) کے جو عام کام ہیں وہ سارے کے سارے ان کے اپنے قوانین کے تحت چلائے گئے اور دین کے معاملات کے احکام کو زندگی سے خارج کر دیا گیا، چنانچہ مسجد ومدرسے میں تو دین کا تذکرہ ہے، لیکن بازاروں میں، حکومت کے ایوانوں میں اور انصاف کی عدالتوں میں دین کا ذکر اور اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا اور غیر مسلموں نے اقتدار پر قبضہ کیا، چونکہ اسلام کے معاملات سے متعلق جو احکام ہیں وہ عمل میں نہیں آرہے تھے اور ان کا عملی چلن دنیا میں نہیں رہا اس

لیے لوگوں کے دلوں میں ان کی اہمیت گھٹ گئی اور بحث ومباحثہ اور ان کے اندر تحقیق واستنباط کا میدان بھی محدود ہو کر رہ گیا۔

فطری نظام ایسا ہے کہ جیسی جیسی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ اس کے حساب سے اسباب پیدا فرماتے رہتے ہیں۔ معاملات کا شعبہ بھی ایسا ہے کہ جب اس پر عمل ہو رہا ہو تو نئے نئے معاملات سامنے آتے ہیں، نئی نئی صورتحال کا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے، فقہاءِ کرام ان پر غور کرتے ہیں، ان کے بارے میں اجتہاد کرتے ہیں اور نئی نئی صورتِ حال کے حل بتاتے ہیں، ان کے بارے میں شریعت کے احکام سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں۔

لیکن جب ایک چیز کا دنیا میں چلن ہی نہیں رہا تو اس کے بارے میں فقہاء سے پوچھنے والے بھی کم ہوگئے، اس کے نتیجے میں فقہاءِ کرام کی طرف سے استنباط کا جو سلسلہ چل رہا تھا وہ بھی دھیما پڑ گیا، میں یہ نہیں کہتا کہ رک گیا، بلکہ دھیما پڑ گیا، اس واسطے کہ اللہ کے کچھ بندے ہر دور میں ایسے رہے ہیں کہ جو اپنی تجارت اور معیشت میں حلال وحرام کی فکر رکھتے تھے، وہ کبھی کبھی علماء کی طرف رجوع کرتے اور علماء ان کے بارے میں کچھ جوابات دیتے جو ہمارے ہاں فتاویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن چونکہ پورا نظام غیر اسلامی تھا اس واسطے غور وتحقیق اور استنباط کے اندر وسعت نہ رہی اور اس کا دائرہ محدود ہوگیا اور اس کی وجہ سے معاملات کے سلسلے میں فقہ کا جو ایک طبعی ارتقاء تھا وہ سست پڑ گیا اور اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جب ہم دینی مدارس میں فقہ اور حدیث وغیرہ پڑھتے پڑھاتے ہیں تو سارا زور عبادات پر صرف کر لیتے ہیں اور جب معاملات کا باب آتا ہے تو چونکہ ذہن میں اس کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور بازار میں اس کا

چلن کم ہوگیا ہے، اس لیے اس پر کچھ زیادہ توجہ اور اہمیت کے ساتھ بحث ومباحثہ کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی، عام طور سے معاملات کے ابواب بھاگتے دوڑتے گزر جاتے ہیں، اس وجہ سے معاملات کی فقہ کو جاننے والے کم ہو گئے ہیں۔ اب جب وہ کم ہوگئے تو ایک طرف بازار میں نئے نئے معاملات پیدا ہورہے ہیں اور نئی نئی صورتیں وجود میں آرہی ہیں، دوسری طرف ان صورتوں کو سمجھنے اور ان کے حکم کا استنباط کرنے والوں کی کمی ہوگئی ہے۔

اب اگر ایک تاجر تجارت کر رہا ہے اور اس کو اس کے اندر روز مرہ نئے نئے حالات پیش آتے ہیں، وہ کسی عالم کے پاس جاتا ہے کہ بھائی میری یہ صورت حال ہے اس کا حکم بتائیں؟ اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ تاجر عالم کی بات نہیں سمجھتا اور عالم تاجر کی بات نہیں سمجھتا، کیونکہ دونوں کے درمیان ایک ایسا فاصلہ قائم ہوگیا ہے کہ ان کی بہت سی اصطلاحات اور بہت سے معاملات میں ان کے عرف اور ان کے طریقِ کار سے عالم ناواقف ہے۔ تاجر اگر مسئلہ پوچھے گا تو وہ اپنی زبان میں پوچھے گا اور عالم نے وہ زبان نہ سنی، نہ پڑھی، لہٰذا وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پاتا۔ عالم جواب دے گا تو اپنی زبان میں جواب دے گا جس سے تاجر محروم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ علماء کے پاس جا کر ہمیں اپنے سوالات کا پورا جواب نہیں ملتا تو انہوں نے علماء کی طرف رجوع کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ سے علماء اور کاروبار کرنے والوں کے درمیان اور معاملات کے اندر بہت بڑا فاصلہ پیدا ہوگیا اور اس کے نتیجے میں خرابی در خرابی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ''فقہ المعاملات'' کو سمجھا جائے اور پڑھا جائے۔

معاملات کی اصلاح کا آغاز

اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سارے عالم میں ایک شعور پیدا ہورہا ہے اور وہ شعور یہ ہے کہ جس طرح ہم عبادتیں شریعت کے مطابق انجام دینا چاہتے ہیں، اسی طرح اپنے معاملات کو بھی شریعت کے سانچے میں ڈھالیں، یہ قدرت کی طرف سے ایک شعور ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں میں رفتہ رفتہ پیدا ہونا شروع ہوا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کی ظاہری شکل وصورت اور ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر دور دور تک یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ یہ متدین ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حرام مال کی نفرت اور حلال مال کی طرف رغبت پیدا فرمادی۔

اب وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح ہمارے معاملات شریعت کے مطابق ہوجائیں اور اس تلاش میں ہیں کہ کوئی ہماری رہنمائی کرے، لیکن اس میدان میں رہنمائی کرنے والے کم ہوگئے، ان کے مزاج ومذاق کو سمجھ کر ان کے معاملات اور اصطلاحات کو سمجھ کر جواب دینے والے بہت کم ہوگئے، اس وقت ضرورت تو بہت بڑی ہے، لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے والے افراد بہت کم ہیں۔

ایک اہم کوشش

اس لیے میں عرصہ دراز سے اس فکر میں ہوں کہ دینی مدارس کے تعلیمی نصاب میں ''فقہ المعاملات'' کو خصوصی اہمیت دی جائے اور اس غرض کے لیے بہت سے اقدامات بھی کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ان میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

بہرحال! یہ بہت ہی اہمیت والا باب ہے اس لیے خیال یہ ہے کہ ''کتاب البیوع''

سے متعلقہ جو مسائل سامنے آئیں انہیں ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ کم از کم ان سے واقفیت ہو جائے۔

نظامہائے معیشت

پہلی بحث اس سلسلے میں یہ ہے کہ آپ نے یہ نام بہت سنے ہوں گے کہ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور اشتراکی نظام (Socialism) اس وقت دنیا میں یہی دو نظام رائج ہیں اور ساری دنیا ان دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، اگرچہ اشتراکیت تو بحیثیت سیاسی طاقت کے بفضلہٖ تعالیٰ ختم ہوگئی ہے، روس کے زوال اور سویت یونین کے بعد اس کو وہ سیاسی طاقت تو حاصل نہیں جو پہلے تھی، لیکن ایک نظریے کے طور پر وہ اب بھی زندہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی جو ریاستیں آزاد ہوئی ہیں اس میں امریکی اثرات پھیلنے کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں بھی پھیلی ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں میں دوبارہ اشتراکی نظام کی طرف رغبت پیدا ہورہی ہے، ابھی سقوط کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا، لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیاں سامنے آنا شروع ہوگئی ہیں، اس لیے لوگ پھر اشتراکی نظریے کو زندہ کرنے کی فکر میں لگ گئے ہیں۔

یہی وجہ کہ روس کی بعض آزاد شدہ ریاستوں میں کمیونسٹ پارٹی (Comunist Party) الیکشن کے اندر بڑے بھاری ووٹ لے کر کامیاب ہوئی، لہٰذا اگرچہ اشتراکیت کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا ہے، لیکن بطور ایک نظریہ کے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اشتراکیت ختم ہوگئی ہے، بلکہ وہ اب بھی زندہ ہے۔

دنیا میں یہ دو متخالف نظریات (اشتراکیت اور سرمایہ داری) رائج رہے ہیں

اور دنیا ان کے درمیان سیاسی سطح پر باہمی جنگ وجدال کی لپیٹ میں رہی ہے، فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث ومناظرہ کا بازار بھی گرم رہا اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر تنقیدیں ہوتی رہتی ہیں اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، تو ایک سرمایہ دارانہ نظام ہے اور دوسرا اشتراکی نظام ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کیا ہیں؟

آج کل لوگ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟ اشتراکی نظام کیا ہے؟ ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ ان میں کہاں غلطی ہے؟ اور ان کے مقابلے میں اسلامی معیشت کے احکام کس طرح ممتاز ہیں؟ یہ بات دو اور دو چار کر کے واضح طور پر ذہنوں میں نہیں ہے، عام طور پر مجمل باتیں کی جاتی ہیں۔

بنیادی معاشی مسائل

اس لیے میں مختصراً اس کو ذکر کرتا ہوں، اس کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ آج معاشیات (Economics) ایک مستقل فن بن گیا ہے، معیشت ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے اور کسی بھی نظامِ معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے وہ بنیادی طور پر چار ہیں۔

ا۔ ترجیحات کا تعین (Determination of priorities)

پہلا مسئلہ جس سے معیشت کو واسطہ پڑتا ہے اس کو معاشی اصطلاحات میں

ترجیحات کا تعین کہتے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ یہ بات واضح اور مسلم ہے کہ انسان کی خواہشات زیادہ ہیں (یہاں ضروریات کا لفظ استعمال نہیں کر رہا ہوں، بلکہ خواہشات کا لفظ استعمال کر رہا ہوں) اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وسائل ان کے مقابلے میں کم ہیں۔

ہر انسان کے دل میں بے شمار خواہشات ہوتی ہیں کہ میرے پاس اتنا پیسہ آجائے، میرے پاس اچھی سواری ہو، میں ایسا مکان بنالوں، مجھے کھانے کو فلاں چیز ملے، وغیر وغیرہ، تو خواہشات تو بہت ہیں، لیکن ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وسائل کم ہیں۔

لطیفہ

ایک لطیفہ ہے کہ ایک دیہاتی تھا، ایک دن کہنے لگا کہ ''یوں جی کرے کہ ڈھیر سارا دودھ ہو اور اس میں ڈھیر سارا گڑ ڈالوں اور اس گڑ کو انگل سے چلا کے خوب پیئوں''۔ کسی نے کہا کہ بھائی تیرا جی تو کرے، لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ کہنے لگا انگل ہے اور تو کچھ بھی نہیں، تو خواہشات تو بہت ہیں، لیکن ان کو پورا کرنے کے وسائل محدود ہیں، ایک انسان کی انفرادی سطح پر بھی یہی معاملہ ہے اور کسی ملک اور معاشرہ کی اجتماعی سطح پر بھی یہی معاملہ ہے۔

فرض کریں ایک انسان کا معاملہ دیکھ لیں اس میں بھی یہی صورتِ حال ہے کہ اس کی خواہشات بہت ہیں اور ایک ملک کی سطح پر دیکھ لیں کہ ملک کی خواہشات بہت ہیں، خواہشات کیا ضروریات بھی بہت ہیں، ہمارا ملک ہے تو اس کی ضرورت یہ بھی ہے کہ اس کی سڑکیں اچھی بنیں، اس کے ہسپتال اچھے تعمیر

ہوں، اس کی تعلیم گاہیں اچھی ہوں، اس کا دفاع مضبوط ہو، یہ بے شمار ضروریات ہیں، لیکن ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے جو وسائل ہیں وہ کم اور محدود ہیں، لہٰذا اس کے بغیر چارہ نہیں کہ انسان کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم رکھے اور کچھ کو مؤخر رکھے، اسی کا نام ترجیح ہے کہ ایک خواہش کو دوسری خواہش پر ترجیح دے کہ میں کون سی خواہش پہلے پوری کروں اور کون سی خواہش بعد میں پوری کروں۔

اب مثلاً ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ کراچی سے لے کر پشاور تک موٹروے بنے اور ایک خواہش یہ بھی ہے کہ ایٹم بم بنے، اب ہمیں ترتیب قائم کرنی پڑتی ہے کہ اتنا پیسہ تو نہیں ہے کہ دونوں کام کریں، لہٰذا جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے اس کو مقدم کریں گے اور دوسرے پر ترجیح دیں گے کہ اس وقت بھارت نے ایٹم بم بنا لیا ہے، اگر اس نے کسی وقت بھی چلا لیا تو ہمارے لیے مصیبت بن جائے گی، اس لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ایٹم بم بنائیں، تو موٹروے کو مؤخر کردیا، اس کو ترجیحات کا تعین کہتے ہیں اور ہر معاشی نظام میں یہ پہلا مسئلہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کیا جائے کہ کون سی چیز مقدم ہو اور کون سی چیز مؤخر ہو۔

۲۔ وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)

یعنی کچھ وسائل ہمارے پاس ہیں، زمینیں ہیں، روپیہ ہے، کارخانے ہیں یہ سب وسائل ہیں۔ ان میں سے کتنے وسائل کو کس کام میں خرچ کیا جائے۔ مثلاً ترجیحات کا تعین کرلیا کہ ہمیں گندم اگانی چاہیے، وہ بھی ضروریات میں داخل ہے، چاول اگانے چاہئیں، وہ بھی ضروریات میں داخل ہیں، کپڑا بنانا چاہیے وہ بھی ضروریات میں داخل ہے، لیکن کتنی زمینوں میں گندم اگائیں، کتنی زمینوں

میں چاول اگائیں اور کتنی زمینوں میں روئی (کپاس) اگائیں، کتنی زمینوں میں چائے اور کتنے میں تمباکو اگائیں؟ اسی طرح کتنے کارخانے کپڑے کے قائم کریں، کتنے جوتے کے قائم کریں اور کتنے اسلحہ کے قائم کریں؟ اس کو وسائل کی تخصیص کہتے ہیں کہ وسائل کو مختلف معاشی سرگرمیوں میں کس طرح مخصوص کیا جائے۔

۳۔ آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income)

تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے کہ ترجیحات کا تعین بھی کر لیا، وسائل کی تخصیص بھی کر دی گئی، اب زمینیں کام میں لگی ہوئی ہیں کہ ان کے اندر چاول اگ رہے ہیں، گندم اگ رہی ہے وغیرہ وغیرہ، کارخانے کام میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں کپڑا بن رہا ہے، ان میں جوتے بن رہے ہیں، ضرورت کی دوسری اشیاء بن رہی ہیں، اس تمام عمل پیداوار کے نتیجے میں جو آمدنی یا پیداوار حاصل ہو اس کو وسائلِ پیداوار میں کس طرح تقسیم کیا جائے؟ اس کو دولت کی تقسیم بھی کہتے ہیں اور آمدنی کی تقسیم بھی کہتے ہیں۔

۴۔ ترقی (Development)

چوتھا مسئلہ ترقی کا ہے ''کماً'' اور ''کیفاً'' بھی ترقی حاصل ہو، مثلاً انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہ رہے، بلکہ آگے بڑھے، اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ آدمی پہلے گدھے پر سفر کرتا تھا، پھر گھوڑے پر سفر کرنے لگا، پھر اونٹ پر، پھر سائیکل بنائی، پھر موٹر سائیکل بنالی، پھر کار بنالی، پھر ہوائی

جہاز بنالیا اور اب ہوئی جہاز میں سفر کرتا ہے۔

تو ترقی انسانی فطرت کا ایک تقاضہ ہے، ہم کس طرح اپنی معیشت میں ترقی کر سکتے ہیں، اس کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ ہم ایک حالت پر نہ رہیں، بلکہ آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یہ وہ چار بنیادی مسائل ہیں جن سے ہر نظامِ معیشت کو سابقہ پڑتا ہے، ترجیحات کا تعین (Determination of priorities)، وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)، آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income) اور ترقی (Development) ہم جب کسی بھی نظامِ معیشت کے بارے میں بات کریں تو سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس نظام نے ان چار مسائل کا حل کس طرح تلاش کیا ہے اور ان چار مسائل میں اس نے کیا طریقۂ کار تجویز کیا ہے۔

ان مسائل کے حل میں ایک راستہ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور دوسرا راستہ اشتراکیت (Socialism) نے اختیار کیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ ان چاروں مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی آزادی دے دی جائے، یعنی ہر ایک کو یہ آزادی دے دی جائے کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کرے، جس طرح چاہے معقول حدود میں رہ کر منافع کمائے اور منافع کمانے کی جد وجہد کرے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ جب منافع کمانے کے لیے ہر شخص کو آزاد چھوڑا جائے گا تو قدرت کی طرف سے دو طاقتیں ایسی مقرر ہیں جو اس منافع کمانے کی جد وجہد کو اس طرح استعمال کریں گی کہ اس سے یہ چاروں مسائل خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے، وہ دو طاقتیں کیا ہیں؟

کہتے ہیں کہ ایک رسد (Supply) ہے اور ایک طلب (Demand) ہے، بازار میں جن اشیاء کی مانگ ہوتی ہے ان کو طلب (Demand) کہتے ہیں اور جو سامان بیچنے کے لیے بازار میں لایا جاتا ہے اس کو رسد (Supply) کہتے ہیں۔

قانونِ قدرت

قدرت کا قانون یہ ہے کہ جب کسی چیز کی رسد بڑھ جائے اور طلب کم ہو تو قیمتیں کم ہوجاتی ہیں، اور اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے اور رسد کم ہو تو قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ گرمی میں برف کی بہت ضرورت پڑتی ہے اور بازار میں ضرورت کے بقدر مہیا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے قیمت بڑھ جاتی ہے اور برف مہنگی ہوجاتی ہے، اس کے برعکس سردی میں برف کی رسد زیادہ ہوتی ہے اور طلب کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے قیمت گھٹ جاتی ہے، تو رسد وطلب یہ قدرت کا ایک قانون ہے جس کا انہوں نے نام رکھا ہے "بازار کی قوتیں" یعنی مارکیٹ فورسز (Market Forces) یہ قدرتی طاقتیں ہیں جو بازار میں کارفرما ہیں۔

اب ایک طرف قدرتی طاقتیں بازار میں کام کر رہی ہیں، دوسری طرف

آدمی سے یہ کہہ دیا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی جدو جہد کرو۔

اب وہ شخص جب بازار آئے گا تو لازماً وہی چیز لائے گا جس کی طلب زیادہ ہوگی اور رسد کم ہوگی۔ اسے کہا گیا ہے کہ زیادہ منافع کماؤ! اب وہ سوچے گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے اور رسد کم ہے، کیونکہ جب وہ چیز لائے گا تو بازار میں زیادہ قیمت وصول ہوگی اور زیادہ منافع کما سکے گا، اگر وہ ایسی چیز بازار میں لے آئے جس کی پہلے ہی رسد زیادہ اور طلب کم ہے تو اس سے نقصان ہوگا۔

جب ہر شخص کو آزادی دے دی گئی کہ تم منافع کماؤ تو اب وہ وہی چیز بازار میں لے کر آئے گا جس کی طلب زیادہ ہو اور رسد کم ہو اور اس وقت تک لاتا رہے گا جب تک رسد طلب کے برابر نہ ہوجائے، جس مرحلے پر رسد اور طلب برابر ہوگی اب اگر اور بھی لے کر آئے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمت گر جائے گی اور اس کا نقصان ہوگا۔

اگر کوئی کپڑے کا تاجر ہے تو وہ دیکھے گا کہ بازار میں کپڑا کتنا ہے؟ اگر وہ محسوس کرے گا کہ طلب زیادہ ہے اور بازار میں جو پیداوار ہورہی ہے وہ کم ہے، قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو وہ کپڑا بازار میں لائے گا، کپڑے کا کارخانہ لگائے گا، لیکن جب رسد اور طلب برابر ہوجائے گی جس کو معاشی اصطلاح میں ''نقطہ توازن'' کہتے ہیں، جب نقطہ توازن قائم ہوجائے گا تو اس وقت بازار میں کپڑا لانا بند کردے گا کیونکہ اس وقت نقصان ہوگا۔

تو سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ اس طرح خود بخود ترجیحات کا تعین ہوجائے گا، ہر آدمی سوچے گا کہ بازار میں کس چیز کی ضرورت ہے؟ کپڑے کی ضرورت ہوگی تو کپڑا بنائے گا، کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ لے

کر آئے گا، جب آدمی نفع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائے گا کہ کون سی چیز بنائی جائے اور کون سی چیز نہ بنائی جائے۔

ایک زمین دار ہے وہ زمین کے اندر چاول بھی اگا سکتا ہے، گندم بھی اگا سکتا ہے، کپاس بھی اگا سکتا ہے، تمباکو اور چائے بھی اگا سکتا ہے، لیکن وہ اگانے سے پہلے یہ سوچے گا کہ اسے کس چیز میں زیادہ فائدہ ہوگا، بازار میں جس کی طلب اور ضرورت زیادہ ہوگی وہ اسے ہی اگائے گا، اگر لوگوں کو آٹا نہیں مل رہا اور وہ افیون کی کاشت کرنے لگے تو وہ احمق ہوگا، اس وقت اس کو افیون کا خریدار کوئی نہیں ملے گا، وہ سوچے گا کہ آٹے کا ملک میں قحط ہے لہٰذا گندم اگانا چاہیے، اسی سے ترجیحات کا تعین بھی ہو رہا ہے اور وسائل کی تخصیص بھی ہو رہی ہے۔

تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے (Distribution of Income)

سرمایہ دارانہ نظام یہ کہتا ہے کہ پیداوار کے چار عوامل ہوتے ہیں، یعنی کوئی بھی پیداواری عمل ہو اس میں چار چیزیں مل کر کام کرتی ہیں تب کوئی پیداوار وجود میں آتی ہے، مثلاً کپڑے کا کارخانہ ہے اس میں کام کرنے والے چار عوامل ہیں۔

① زمین (Land): ایسی جگہ جہاں کام کیا جائے، یہ ایک عاملِ پیداوار ہے۔

② سرمایہ (Capital) سرمایہ سے مراد روپیہ ہے، آدمی کے پاس روپیہ ہوگا تو وہ اس سے تعمیر کرے گا، مشینری وغیرہ خریدے گا وغیرہ وغیرہ۔

③ محنت(Labour) یعنی اگر زمین بھی ہو سرمایہ بھی ہو، لیکن محنت نہ ہو تو کام نہیں ہوسکتا، لہٰذا محنت کرنے کے لیے مزدور لانے پڑتے ہیں۔

④ آجر یا تنظیم : چوتھی چیز جس کا اردو میں ترجمہ بڑا مشکل ہے بعض اس کو آجر کہتے ہیں اور بعض اسی کو تنظیم کہتے ہیں، ایسا آدمی جو ان تینوں عوامل کو اکٹھا کرکے ان کی تنظیم کرے اور ان سے کام لے، اس کو انگریزی میں(Entrepreneur) کہتے ہیں، یہ اصل میں فرانسیسی لفظ ہے اس کا اردو میں صحیح ترجمہ "مہم جو" ہے، یعنی جو بیڑا اٹھائے کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور اس میں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگائے کہ میں یہ کام کروں گا، خطرہ(Risk) مول لیتا ہے، پھر ان چیزوں کو جمع کرتا ہے، زمین لیتا ہے، سرمایہ مہیا کرتا ہے، مزدور مہیا کرتا ہے آگے جا کر یہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے کہ جو سامان تیار ہوگا نہ معلوم وہ فروخت ہو یا نہ ہو۔

تو یہ چاروں عواملِ پیداوار(Factors of Production) ہوتے ہیں، زمین، سرمایہ، محنت اور آجر یا تنظیم۔

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ ان چاروں عوامل نے مل کر آمدنی پیدا کی ہے اس لیے ان چاروں عوامل کا آمدنی میں حصہ ہے۔

زمین کا حصہ کرایہ ہے یعنی جس آدمی نے کاروبار کے لیے زمین دی ہے وہ اس بات کا حقدار ہے کہ اس کو زمین کا کرایہ دیا جائے۔

سرمایے کا حصہ سود ہے یعنی جس نے سرمایہ مہیا کیا اس کو اس بات کا حق

ہے کہ وہ سود کا مطالبہ کرے کہ میں اتنا سرمایہ، اتنے پیسے دیے تھے۔ مثلاً: میں نے تمہیں ایک لاکھ روپیہ دیا تھا اس میں سے مجھے دس فی صد سود دو۔

محنت یعنی مزدور کا حق ہے کہ وہ اجرت یعنی اپنی مزدوری وصول کرے۔

یہ تین چیزیں دینے کے بعد یعنی زمین کا کرایہ (Rent)، سرمایہ کا سود (Interest) اور مزدوری کی اجرت (Wages) جو کچھ بچے وہ آجر یا تنظیم کا منافع (Profit) ہے کیونکہ اس نے ان سب کو لگانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اور خطرہ بھی مول لیا تھا، لہٰذا جو کچھ بچے وہ سارا آجر کا منافع ہے۔

سوال: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے یہ تو کہہ دیا کہ زمین کا کرایہ ملے گا، سرمایہ کو سود اور مزدور کو اجرت ملے گی، لیکن زمین کو کتنا کرایہ، سرمایہ کو کتنا سود اور مزدور کو کتنی اجرت ملے گی؟ اس کا تعین کیسے ہوگا؟

جواب: سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا ہے کہ اس کا تعین بھی وہی رسد وطلب کرے گی، زمین کا کرایہ، مزدور کی اجرت اور سرمایہ کا سود ان کی مقدار کا تعین بازار کی قوتیں رسد اور طلب ہی کریں گی، مثلاً زید کو ایک کارخانہ لگانا ہے، اس کے لیے زمین چاہیے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زمین کی کتنی رسد ہے اور طلب کتنی ہے؟ آیا زمین کرایے پر لینے والا زید تنہا ہی ہے یا اور لوگ بھی اس فکر میں ہیں کہ زمین کرایہ پر لیں، اگر زید تنہا ہی زمین کا لینے والا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ زمین کی طلب کم اور رسد زیادہ ہے لہٰذا زمین کا کرایہ بھی کم ہوگا اور اگر ساری قوم زمین کی تلاش میں ہے اور زمینیں گنی چنی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی رسد کم

ہے اور طلب زیادہ ہے لہٰذا زمین کا کرایہ بھی زیادہ ہوگا، تو رسد اور طلب کی طاقتیں جہاں مل جائیں گی وہاں کرایے کا تعین ہوگا۔

فرض کریں زید کو زمین کی ضرورت ہے اور وہ ایک ہزار سے زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا، اب وہ ایک ہزار ماہانہ کے حساب سے زمین کی تلاش میں نکلا، بازار میں جا کر دیکھا کہ وہاں پوری قوم زمین کی تلاش میں پھر رہی ہے، کوئی پانچ ہزار ماہانہ دینے کو تیار ہے، کوئی سات ہزار دینے کو تیار ہے اور زمینیں کم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زید کو ایک ہزار میں زمین نہیں ملے گی، لہٰذا اسے چاروناچار پانچ ہزار میں کسی سے بات کرنی ہوگی۔

اسی طرح اگر زمین والا دل میں یہ ارادہ بٹھا لیتا ہے کہ میں اپنی زمین دس ہزار ماہانہ سے کم پر نہیں دوں گا، بازار میں جا کر دیکھتا ہے کوئی پانچ ہزار دینے کو تیار نہیں کہ زمین کی رسد زیادہ ہوگئی ہے اور طلب کم ہے لہٰذا وہ لازماً پانچ ہزار میں دینے پر مجبور ہوگا۔

تو پانچ ہزار کا نکتہ ایسا ہے جس پر رسد وطلب جا کر مل جائیں گے اور کرایہ متعین ہوجائے گا، تو زمین کا کرایہ متعین کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ رسد وطلب کی طاقتیں متعین کریں گی۔

سود میں بھی یہی طریقہ ہے کہ آدمی کاروبار کے لیے روپیہ چاہتا ہے، وہ بینک کے پاس جاتا ہے کہ کاروبار کے لیے پیسے چاہئیں، بینک اس کو کہتا ہے کہ میں اتنے سود پر مہیا کروں گا، اب اگر روپے کی طلب زیادہ ہے اور روپیہ کم ہے تو سود کی شرح بڑھ جائے گی اور اگر اس کے برعکس روپے کی طلب تو کم ہے،

رسد زیادہ ہے تو سود کی شرح گھٹ جائے گی، تو یہاں بھی رسد اور طلب مل کر سود کی شرح متعین کریں گے۔

یہی معاملہ مزدور کا بھی ہے اگر بازار میں مزدوروں کی رسد زیادہ ہے، ہزاروں جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے روزگار ملے، کارخانے کم ہیں تو اجرت بھی کم ہوگی اس واسطے کہ رسد زیادہ ہے۔

کارخانے دار کے پاس مزدور جاتا ہے کہ مجھے رکھ لو، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں رکھتا، مزدور کہتا ہے کہ مجھے ایک روپیہ یومیہ پر رکھ لو مگر رکھ لو، اب کارخانے دار سوچتا ہے کہ دوسرا آدمی دو روپے یومیہ پر کام کر رہا ہے یہ اس سے سستا پڑتا ہے اس لیے دوسرے آدمی کی چھٹی کرادی اور اس سے کہا کہ تم آجاؤ۔

اس کے برعکس اگر مزدوری کرنے والے کم ہوں اور محنت طلب کرنے والے زیادہ ہوں تو اس صورت میں اجرت بڑھ جائے گی۔

یہاں ہمارے ملک میں چونکہ بے روزگار زیادہ ہیں اس لیے اجرتیں کم ہیں، لیکن انگلینڈ میں جا کر دیکھ لیں وہاں اجرتیں آسمانوں پر پہنچی ہوئی ہیں، ہم لوگ عیش کر رہے ہیں، گھروں میں کام کرنے کے لیے نوکر موجود ہیں، لیکن وہاں اگر گھر میں کام کرنے کے لیے نوکر رکھنا پڑ جائے تو دیوالیہ نکل جائے اس لیے کہ نوکر اتنا مہنگا ملتا ہے، اجرتیں بڑھی ہوئی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدوروں کی رسد کم اور طلب زیادہ ہے، چنانچہ مزدور کی اجرت بھی رسد اور طلب کے نتیجے میں متعین ہوگی۔

چوتھا مسئلہ ترقی (Development) کا ہے

جب آپ نے ہر انسان کو منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تو وہ بازار میں ایسی چیز لانے کی کوشش کرے گا جو زیادہ دلکش اور مفید و پائیدار ہو اور لوگ اس کی طرف زیادہ رغبت کریں۔

اگر ایک آدمی کار بنا رہا ہے اور سالہا سال سے ایک ہی طرح کی کار بنائے جا رہا ہے تو اس سے لوگ اکتا جائیں گے، تو وہ چاہے کہ میں کار کو ایسا بناؤں کہ اس کے نتیجے میں لوگوں سے زیادہ پیسے مانگ سکوں، تو وہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی نئی چیز لگا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختراع کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس کو بروئے کار لا کر انسان نئی سے نئی چیز پیدا کرتا ہے تو ترقی خود بخود ہوتی چلی جائے گی، جب انسان کو زیادہ منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تو اب انسان ایک سے ایک چیز پیدا کرے گا، بازار میں دیکھ لیں یہی ہو رہا ہے، ہر روز نئی پیداوار سامنے آتی ہے، اس لیے کہ آدمی سوچتا ہے کہ میں ہر روز نئی چیز لے کر آؤں جس کی طرف لوگ مائل ہوں اور جس کی طرف لوگ بھاگیں، اس طرح سے دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے میں معیشت کے تمام مسائل حل کرنے کے لیے ایک ہی جادو کی چھڑی ہے یعنی رسد اور طلب کی بازاری قوتیں، اس کو مارکیٹ میکنزم (Market Mechanism) بھی کہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اصول

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول تین ہیں۔

① انفرادی ملکیت کا احترام کہ ہر شخص کی ملکیت کا احترام کیا جائے۔

② منافع کمانے کے لیے لوگوں کو آزاد چھوڑنا۔

③ اور حکومت کی طرف سے عدمِ مداخلت یعنی حکومت بیچ میں مداخلت نہ کرے کہ تاجروں پر پابندی لگا رہی ہے، یہ کر رہی ہے، وہ کر رہی ہے، بلکہ انہیں آزاد چھوڑ دو۔

سوال: مہم جو یعنی آجر یا تنظیم کا منافع تو طلب ورسد سے تعین نہیں ہوا؟

جواب: وہ اس طرح سے متعین ہوا کہ جب طلب ورسد سے اجرت بھی متعین ہوئی، سود بھی متعین ہوا، کرایہ بھی متعین ہوا اور جو چیز باقی بچے اس کا نام منافع ہے، اور باقی بچنے والی مقدار کتنی ہے؟ وہ موقوف ہے ان تینوں چیزوں کے تعین پر اور یہ تینوں چیزیں رسد وطلب سے متعین ہوتی ہیں لہٰذا وہ بھی بالواسطہ رسد وطلب سے متعین ہو رہا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب وہ اپنی چیز اپنی پیداوار بازار لے کر گیا تو وہاں جتنی قیمت ملے گی وہ طلب ورسد کی حیثیت سے حاصل ہوگی، پھر اس قیمت میں سے ان تینوں کو جو ادائیگی ہوگی وہ بھی طلب ورسد کی بنیاد پر ہوگی، لہٰذا جو باقی بچے گا وہ بھی درحقیقت طلب ورسد کا ہی کرشمہ ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کا خلاصہ ہے۔

اشتراکیت (Socialism)

اشتراکیت میدان میں آئی، اس نے کہا کہ جناب آپ نے معیشت کے

اتنے اہم اور بنیادی مسئلے کو طلب ورسد کی اندھی اور بہری طاقتوں کے حوالے کردیا ہے، آپ نے کہا کہ ہر کام اسی سے ہوگا یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے، اس پر اشتراکیت نے دو بنیادی تنقیدیں کیں۔

سرمایہ دارانہ نظام پر تنقیدیں

پہلی تنقید

اشتراکیت کی طرف سے یہ تنقید کی گئی کہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی بازار میں وہی چیز لائے گا جس کی بازار میں زیادہ طلب ہوگی اور جب طلب رسد کے برابر ہوجائے گی تو بنانا چھوڑ دے گا اس واسطے کہ مزید بنائے گا تو نفع کم ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نقطہ ہے جس پر پہنچ کر طلب اور رسد برابر ہوں گے؟ کیا ہر انسان کے پاس خودکار میٹر موجود ہے جس سے وہ اندازہ کرے کہ اب طلب ورسد برابر ہوگئے ہیں؟ لہٰذا اب مزید نہیں بنانا چاہیے یا کوئی فرشتہ غیب سے آکر اس کو بتلائے گا کہ اب رسد وطلب برابر ہوگئی ہے، اب مزید مت بنانا، نہ کوئی ایسا میٹر موجود ہے، نہ کوئی ایسی غیبی طاقت موجود ہے جو آکر تاجر کو بتا دے کہ اب چیزیں بنانا بے کار ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عملاً ایسا ہوتا ہے کہ تاجر اپنی مصنوعات بناتا چلا جاتا ہے، اس گمان پر کہ ابھی تک طلب رسد کے برابر نہیں ہوئی، لیکن حقیقت میں طلب رسد کے برابر ہوچکی ہوتی ہے اور تاجر اس زعم باطل میں مبتلا ہے، دوسرا بھی اسی میں مبتلا ہے، تیسرا بھی اسی میں مبتلا ہے،

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اس زعم باطل کے واشگاف ہوتے ہوتے کروڑوں ٹن سامان ضرورت سے زیادہ بن گیا، تب آنکھیں کھلیں کہ یہ تو بہت زیادہ ہوگیا، بازار میں قیمتیں گرنے لگیں، کساد بازاری آگئی، کارخانے بند ہونا شروع ہوگئے، اس واسطے کہ سامان ضرورت سے زیادہ ہوگیا، بازار میں قیمتیں اتنی گر گئیں کہ لاگت بھی وصول نہیں ہورہی ہے، کارخانے بے کار ہورہے ہیں، انہوں نے کہا کہ انہیں بند کردو، چنانچہ کارخانے بند ہوگئے، کارخانے بند ہونے کا مطلب ہے کہ ہزارہا مزدور بے کار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے روزگاری پھیل گئی، اس کو کساد بازاری کہتے ہیں اور یہ اتنی بڑی بلا ہے کہ معاشی بیماریوں میں شاید اس سے زیادہ خطرناک بیماری اور کوئی نہیں ہے۔

آج لوگ سمجھتے ہیں کہ افراطِ زر بہت بڑی بلا ہے یعنی قیمتوں کا چڑھ جانا، لیکن قیمتوں کے چڑھ جانے سے کساد بازاری زیادہ خطرناک چیز ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں ملک معاشی طور پر تباہ ہوجاتا ہے، کارخانے بند اور لوگ بے روزگار ہوجاتے ہیں۔

اب چونکہ کساد بازاری ہے لوگوں نے کہا کارخانے مت لگانا جو سامان بنا تھا وہ سستے داموں بک گیا، لوگ ڈر اور خوف میں مبتلا ہیں کہ کارخانے مت لگانا کیونکہ اس میں نقصان ہے، یہاں تک کہ رسد کم پڑگئی اور طلب بڑھ گئی، اب مزید کوئی سامان بنانے کے لیے تیار نہیں کیونکہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے، تاجر کہتا ہے کہ مثلاً میں کپڑے کا کارخانہ نہیں لگاؤں گا کیونکہ میں اس سے تباہ ہوچکا ہوں، لوگ کپڑے مانگ رہے ہیں اور وہ نہیں مل رہے ہیں، پھر اچانک کچھ لوگ آتے ہیں کہ اب حالات بدل گئے ہیں، اب طلب بڑھ گئی ہے، چلو اب کارخانے لگاتے ہیں، لیکن یہ جو درمیانی وقفہ تھا یہ

البتہ جائز اگر ہے تو وہ محنت کی مزدوری ہے اور جو حقیقت میں آمدنی کی مستحق تھی اس کو آپ نے رسد وطلب کے تابع کر دیا اور وہ جتنی کم ہو کوئی حرج نہیں ہے حالانکہ حقیقی مستحق تو وہی تھا، لہٰذا آپ کا فلسفہ بالکل بیوقوفی کا فلسفہ ہے، لغویت ہے اور ناانصافی پر مبنی ہے، پھر صحیح بات کیا ہے؟

کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ساری زمین اور سارے وسائلِ پیداوار کسی کی بھی شخصی ملکیت میں نہیں ہونی چاہئیں، نہ زمین کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، نہ کارخانہ کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ سب کو سرکار کی تحویل میں دے دیا جائے جو نمائندہ حکومت ہے، جمہوری حکومت ہے اس کی تحویل میں دے دیے جائیں کہ زمینیں بھی تمہاری ملکیت میں اور کارخانے بھی تمہاری ملکیت میں اور آپ چاروں مسائل یعنی ترجیحات کا تعین (Determination of priorities)، وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)، آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income) اور ترقی (Development) ان کو منصوبہ بندی کے ذریعے حل کریں، یعنی منصوبہ بنائیں کہ ہمارے ملک میں کتنی آبادی ہے، فی کس کتنی گندم چاہیے، فی کس کتنے چاول چاہئیں، فی کس کتنے گز کپڑا چاہیے اور فی کس کتنی چائے چاہیے؟

اس حساب سے یہ دیکھیں کہ ہمارے پاس کتنی زمینیں ہیں؟ اب منصوبہ بندی کر کے جتنی ضرورت ہو اس منصوبہ کے مطابق اتنی زمین میں گندم اگاؤ، اتنی زمین میں چاول اگاؤ اور اتنے ہی کارخانے لگاؤ، جتنے معاشی فیصلے کرو وہ منصوبہ بندی سے کرو اور پھر اس طرح جو پیداوار حاصل ہو وہ جو مزدور کام کر رہے ہیں ان میں تقسیم کر دو، اللہ اللہ خیر سلا، نہ سود، نہ سرمایہ، نہ کرایہ، نہ منافع۔

تو ساری زمین سارے کارخانے سب کچھ قومی ملکیت میں لے لیں اور منصوبہ بندی کر کے ترجیحات کا تعین کریں، وسائل کی تخصیص کریں، آمدنی کی تقسیم کریں اور ترقی کے مسائل کو منصوبہ بندی سے حل کریں، یہ اشتراکیت کا فلسفہ ہے۔

اسی واسطے اشتراکیت کا دوسرا نام منصوبہ بند معیشت ہے جسے پلینڈ اکانومی (Planned Economy) کہتے ہیں اور سرمایہ دارانہ معیشت کا دوسرا نام مارکیٹ اکانومی (Market Economy) ہے، یعنی بازار کی معیشت، کیونکہ وہاں بازار کا تصوّر ہے اور اشتراکیت میں بازار کا تصور نہیں وہ محض نام نہاد بازار ہے، کیونکہ کارخانے سب حکومت کے ہیں، جو پیداوار ہورہی ہے اس کی قیمت حکومت نے مقرر کردی، بازار میں جو بیچنے کے لیے بیٹھا ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے، حکومت کا کارندہ ہے، قیمت متعین ہے بھاؤ تاؤ کا سوال نہیں، بلکہ گورنمنٹ نے جو قیمت مقرر کردی اسی قیمت پر چیز ملے گی، لینا ہو لے لو ورنہ بھاگو، لہٰذا بازار کا وہ تصور جس سے ہم متعارف ہیں (Competition) ہورہا ہے، مقابلہ ہورہا ہے، یہ نہیں ہے اس لیے اس معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں سرمایہ دارانہ نظام ہوتا ہے وہاں ہر آدمی اپنی اپنی پیداوار کو رواج دینے کے لیے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتا ہے، پبلسٹی کرتا ہے، اشتہار چھاپتا ہے، شہر کے اندر اشتہارات کے بورڈ نظر آتے ہیں، اشتراکی ملک میں ان چیزوں میں سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا، نہ وہاں بورڈ ہے، نہ وہاں اشتہار ہے اس لیے کہ کسی کو اس کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ کوئی چیز ذاتی ملکیت

میں نہیں ہے، بازار میں جو کچھ فروخت ہو رہا ہے جا کر بازار میں دیکھیں اگر پسند آجائے تو قیمت لکھی ہوئی ہے لے لیں، اگر نہیں پسند تو نہ لیں، اس لیے اس میں بازار کا تصوّر نہیں ہے، اس اس کو پلینڈ اکانومی (Planned Economy) یعنی منصوبہ بند معیشت کہتے ہیں اور اُس کو مارکیٹ اکانومی (Market Economy) بازار کی معیشت کہتے ہیں۔

اشتراکی نظام پر تبصرہ

جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے اس نے جو فلسفہ پیش کیا اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان کے بنیادی فلسفے کے مطابق معیشت کے جتنے مسائل ہیں ان کے نزدیک سب کا حل یہ ہے کہ تمام وسائل پیداوار قومی ملکیت میں لے کر ان کی منصوبہ بندی کی جائے، درحقیقت یہ ایک مصنوع اور استبدادی طریقہ ہے۔

معیشت بھی معاشرت کے بے شمار مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اس میں پسند اور ناپسند کے فیصلے منصوبہ بندی کی بنیاد پر نہیں ہوسکتے۔

مثال کے طور پر شادی بیاہ کا معاملہ ہے، اس میں مرد کو اپنے لیے مناسب عورت چاہیے اور عورت کو اپنے لیے مناسب مرد چاہیے اور ہوتا یہ ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں اور پھر آپس میں بات چیت ہو کر معاملہ طے پاتا ہے۔ اب اس معاملہ میں بعض اوقات فیصلوں میں غلطیاں بھی ہوجاتی ہیں اور جوڑ صحیح نہیں بیٹھتا، آپس میں نااتفاقی اور ناچاقی بھی پیش آتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ ناچاقیاں اس لیے ہو رہی ہیں کہ یہ باہمی

پسند وناپسند سے فیصلے ہورہے ہیں لہٰذا اب منصوبہ بندی کرو کہ ملک میں کتنے مرد ہیں؟ اور کتنی عورتیں؟ اس حساب سے منصوبہ بندی کی بنیاد پر ان کی شادیاں کرائی جائیں تو ظاہر ہے یہ چلنے والی بات نہیں ہے، یہی معاملہ معیشت کا بھی ہے کہ اس میں ہر ایک آدمی کی افتادہ طبع ہوتی ہے، اس افتادہ طبع کو معیشت کے معاملات میں استعمال کرنا پڑتا ہے۔

اب اگر اس کی منصوبہ بندی کردی جائے کہ تم فلاں کارخانے میں کام کروگے یا فلاں زمین پر کام کروگے اور اس کو اس سے مناسبت نہیں تو اس طرح اس کی صلاحیتیں ضائع ہوں گی اور اس کی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لیا جاسکے گا اور یہ نظام شدید قسم کے استبداد کے بغیر چل بھی نہیں سکتا۔

مثلاً ایک شخص کی ڈیوٹی روئی کے کارخانے میں لگادی جائے کہ جاکر روئی کے کارخانے میں کام کرو، اس کا دل وہاں کام کرنے کو نہیں چاہ رہا ہے، وہ بھاگنا چاہتا ہے تو اسے استبداد کے ذریعے ہی روکا جاسکتا ہے، لہٰذا شدید قسم کی جکڑ بند اور شدید قسم کا استبداد جب تک نہ ہو اس وقت تک نہ نظام نہیں چل سکتا، چنانچہ دنیا میں یوں تو استبداد کے بہت سے نظام آئے، لیکن جتنا استبداد اشتراکیت میں تھا اتنا کسی اور نظام میں مشکل سے ملے گا۔

خلاصہ یہ کہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی بالکل سلب ہوجاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آزادی سلب ہوجائے گی اور آدمی کو مجبور کردیا جائے گا تو وہ اپنے ذوق وشوق سے محنت کرنے سے کترائے گا اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی شخص کا ذاتی مفاد کسی چیز سے وابستہ ہوتا ہے تو اس سے اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور اگر ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو تو دلچسپی اس درجے برقرار نہیں رہتی، تو وہاں

اشتراکی نظام کے اندر چونکہ صنعتیں اور کارخانے ہیں وہ کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں تو ہوتے نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنے لوگ کام کرتے ہیں ان کو ہر صورت میں تنخواہ ملتی ہے، اس صنعت کو ترقی ہو یا نہ ہو، فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، فروغ ہو یا نہ ہو، اب کیوں اس کے اندر زیادہ محنت کرے، کیوں زیادہ وقت صرف کرے، نتیجہ یہ کہ دلچسپی برقرار نہیں رہتی، ڈیوٹی تو ان کو آٹھ گھنٹے ادا کرنی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ خود اپنے ملک پاکستان میں دیکھ لیجیے کہ بھٹو صاحب کے ابتدائی دور کے اندر انہوں نے بہت سی صنعتیں قومی ملکیت میں لیں، جتنی صنعتیں قومی ملکیت میں گئیں سب ڈوبیں، اور اس کا انجام بالآخر یہ ہوا کہ وہ نقصان میں گئیں، انہوں نے خسارہ اٹھایا اور اب آخر کار سب مجبور ہو رہے ہیں کہ دوبارہ ان کو نیلام کر کے شخصی ملکیت میں دیا جائے تاکہ وہ صنعتیں صحیح طریقے سے کام کر سکیں۔

آج کل یونائیٹڈ بینک کا بہت بڑا اسکینڈل چل رہا ہے (جو حبیب بینک کے بعد ملک کے دوسرے نمبر کا بینک ہے) اب اس کا حال یہ ہو رہا ہے کہ دیوالیہ نکلنے کے قریب ہے اور اب اس کو بالآخر افراد کے حوالے کرنے کی فکر کی جارہی ہے، اشتراکی ممالک میں ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا، کیونکہ دکاندار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ سامان زیادہ بک رہا ہے یا کم بک رہا ہے، دونوں حالتوں میں ان کو وہ تنخواہ ملنی ہے جو مقرر ہے، تو اس واسطے وہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے یا گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے فکر نہیں کرتا۔

الجزائر کا ایک چشم دید حال

الجزائر میں ایک دکان میں خود میرا ایک واقعہ پیش آیا کہ مجھے ایک تفسیر جو

"التحریر و التنویر" علامہ طاہر بن عاشور کی ہے وہ خریدنی تھی، تو شام کے وقت پانچ بجنے کا وقت قریب تھا، میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں یہ تفسیر خریدنا چاہتا ہوں اور تفسیر خریدنے کے معنی یہ تھے کہ وہ بارہ سو (الجزائری) دینار کی تھی، لیکن میرے پاس الجزائری دینار نہیں تھے، امریکی ڈالر تھے، میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں جا کر اس کو کھلوا کر لاتا ہوں، آپ براہِ کرم اتنی دیر میرا انتظار کیجیے تو اس نے جواب دیا کہ نہیں پانچ بجے دکان بند ہوجائے گی، میں نے کہا کہ مجھے صرف پانچ منٹ کی مہلت دیجیے، میں جلدی سے جا کر اس کو الجزائری دینار میں تبدیل کرا کے دوڑتا ہوا پہنچا اور پانچ بج کر ایک یا دو منٹ ہوئے تھے کہ دکان بند ہوگئی تھی اور دکان دار غائب، نتیجہ یہ کہ وہ الجزائری دینار آج تک میرے پاس پڑے ہوئے ہیں، کہیں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور کبھی الجزائر جانا ہوا تو استعمال ہوں گے ورنہ دنیا میں کوئی اس کو لینے کے لیے تیار نہیں ہے، یہ ایک واقعہ ہے جو میں نے آپ کو بتایا اور یہ عام ہے کہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے اشتراکی ملک میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا، اس واسطے نہیں لیتے کہ سامان زیادہ بکے یا نہ بکے اس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے چوہتر سال تک اشتراکی نظام نے جس ملک کے اندر اپنا تسلط قائم رکھا بالآخر وہیں اس کا برا حال ہوگیا اور لوگ اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

دوسری طرف یہ کہا گیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں نے وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر رکھا ہے، زمینوں پر، کارخانوں پر اور لوگوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں، اگر دیکھا جائے تو پہلے ظلم ڈھانے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے، لیکن اب جب ساری دولت سمٹ کر حکومت کے ہاتھوں میں آگئی جس کا مطلب ہے

چند سو افسران کے ہاتھوں میں، تو جب یہ افراد دولت کے اتنے بڑے تالاب پر قابض ہوگئے تو ان کی بدعنوانیاں، ان کی نوکر چاہی اور ان کی بدکرداریاں بہت زیادہ ہونے لگیں، کیونکہ اگر ایک آدمی ایک کارخانہ کا مالک ہے اور وہ لوگوں پر ظلم ڈھاتا ہے تو جو گروپ ملک کی تمام دولت پر قابض ہو وہ اس سے زیادہ ظلم کا ارتکاب کرے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو ہوگا کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہوجائیں گے اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آجائے گا جو دولت کے سارے وسائل کو من مانی طریقے سے استعمال کرے گا۔

چونکہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور کی طبعی افتاد کو مد نظر نہیں رکھا گیا تھا اس لیے یہ نظام چوہتر (۷۴) سال چلنے کے بعد زمین پر منہ کے بل گر پڑا، اس نظام کا تجربہ بھی ہوگیا اور تجربہ سے بھی یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ غلط نظام تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ

سرمایہ دارانہ نظام کی غلطی کو سمجھنے کے لیے ذرا دقتِ نظر کی ضرورت ہے، کیونکہ جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کے اس نکتے کا تعلق ہے کہ معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ بازار کی قوتوں کی بنیاد پر ہیں، رسد وطلب کی طاقتوں کی بنیاد پر ہیں، یہ فلسفہ بنیادی طور پر غلط نہیں اور قرآن وسنت سے اس کی تائید ہوتی ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَہُمۡ مَّعِیۡشَتَہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَہُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعۡضُہُمۡ بَعۡضًا

سُخْرِیًّا[1]

دنیوی زندگی میں ان کی روزی کے ذرائع بھی ہم نے ہی
ان کے درمیان تقسیم کر رکھے ہیں اور ہم نے ہی ان میں
سے ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے، تاکہ وہ
ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔

ان کے درمیان معیشت کی تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت عطا کی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ایسا نظام بنایا ہے کہ بازار میں پہنچنے کے بعد مختلف لوگ اپنی افتادِ طبع کے مطابق لوگوں کی طلب پوری کرتے ہیں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بازار میں رسد وطلب کا نظام شریعت نے قائم کیا ہے۔

ایک حدیث میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ولا یبیع حاضر لباد"[2]

کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے، وہاں ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم عن بعض"[3]

---

(۱) سورۃ الزخرف آیت (۳۲)۔
(۲) صحیح البخاری ۷۲/۳ (۲۱۵۸)۔
(۳) صحیح مسلم ۱۱۵۷/۳ (۱۵۲۲)۔

لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائیں، یعنی بیچ میں مداخلت نہ کرو۔

اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں کو تسلیم کیا ہے، انفرادی ملکیت کو بھی تسلیم کیا ہے، منافع کے محرک کو بھی تسلیم کیا ہے کہ آدمی اپنے منافع کے لیے کام کرے، لیکن غلطی یہاں سے لگی کہ یہ کہہ دیا کہ اپنے منافع کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو اس طرح آزاد چھوڑ دو کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے، اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب منافع حاصل کرنا مقصود ہو تو جو بھی طریقہ چاہو استعمال کرو، چاہے سود کے ذریعے ہو، چاہے قمار کے ذریعے ہو، چاہے سٹہ بازی کے ذریعے ہو، حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں، بلکہ یہ کہا کہ جس طرح بھی تمہیں منافع ملے کماؤ، نہ تو کوئی اخلاقی پابندی ہے، لہٰذا ننگی فلمیں تیار کرو، اس میں منافع مل رہا ہے، عریاں رسالے اور عریاں فلمیں مغربی ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

ایک عریاں بالکل مادر زاد برہنہ تصویروں کا رسالہ ہے، اس کے ایک مہینہ میں بیس ملین نسخے فروخت ہوتے ہیں، بیس ملین کے معنی ہیں دو کروڑ، ایک مہینہ میں دو کروڑ نسخے فروخت ہوتے ہیں، تو جب نفع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا تو انسان کے فطری جذبات کو برانگیختہ کر کے نفع کمایا۔

ماڈل گرلز (Model girls) کی کارکردگی

کچھ عرصے پہلے ایک امریکی رسالہ (Times) میں اطلاع آئی تھی کہ امریکہ میں خدمات کے میدان میں جو سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ہے وہ

ماڈل گرل (Model girl) ہے، کئی ملین ڈالر یومیہ کماتی ہیں، تو جب منافع کمانے کا ہر طریقہ جائز ہوگیا تو اس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں رہی، جائز وناجائز، اخلاقی وغیر اخلاقی، مناسب اور نامناسب کی کوئی تفریق نہیں رہی۔

عصمت فروشی کا قانونی تحفظ

عصمت فروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے کاروبار کو بہت سے مغربی ملکوں میں قانونی تحفظ حاصل ہے، اگرچہ بہت سے ملکوں میں اب بھی قانوناً منع ہے، لیکن بہت سے ملکوں نے اس کو قانوناً تحفظ فراہم کردیا ہے۔ پچھلے دنوں لاس اینجلس میں عصمت فروش عورتوں کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن ملکوں نے ابھی تک لائسنس نہیں دیا وہ بھی لائسنس دیں، تو جب منافع کمانے کے لیے ہر شخص آزاد ہے اور اس پر کوئی پابندی، کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو وہ ہر طریقہ اختیار کرے گا۔

ایک انٹرنیشنل ماڈل گرل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی کمپنیوں کے ساتھ بھی ماڈلنگ کرتی ہے، اس کی فیس اس کے لگ بھگ ہوتی ہے وہ تو علیحدہ اور دوسرے ملکوں میں جانے کا فرسٹ کلاس ٹکٹ کا کرایہ الگ، فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کا خرچہ الگ اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ تین سال تک وہ کمپنی جتنی مصنوعات بنائے گی اس کی منہ مانگی مقدار اس کو مفت فراہم کرے گی، اس طرح کی شرائط عائد ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں اشیاء کی لاگت میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام اس کو برداشت کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ہر ایک آدمی کو آزاد چھوڑ دو اس سے اخلاقی خرابیاں بے انتہاء پیدا ہوتی ہیں اور عوام سے پیسے سمیٹنے کا ہر طریقہ جائز قرار دے دیا اور سمٹ سمٹ کر امیروں اور

طاقتوروں کے پاس جارہا ہے، بے چارہ غریب آدمی پس رہا ہے، اس لیے کہ وہ جو بھی چیز خریدنے جائے گا اس کے اندر ساری لاگتیں، ساری عیاشیاں شامل ہیں اور غریب آدمی ساری برداشت کرتا اور ادا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں کتنی ناہمواریاں پھیلتی ہیں، اسی طرح قمار (جوا) جو نئی نئی شکلوں میں پھیل رہا ہے یا سٹہ بازی ہو، اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کا بازار گرم ہے اور اس کے نتیجے میں پوری دنیا میں ایک طوفان برپا ہے۔

تو جب لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا تو انہوں نے سود، قمار اور سٹہ کے ذریعے اپنی اجارہ داریاں (Monopolies) قائم کرلیں، اجارہ داری کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی خاص صنعت پر اس طرح قابض ہوگیا کہ لوگ مجبور ہوگئے ہوں کہ جب بھی اس صنعت کی چیز کو خریدیں تو اسی سے خریدیں اور رسد وطلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں بازار میں آزاد مسابقت (Free Competition) ہو، آزاد مقابلہ ہو، ایک شے دس آدمیوں کے پاس مل رہی ہے، اگر ایک آدمی زیادہ پیسے وصول کرے گا تو لوگ اس کے پاس جانے کے بجائے دوسرے تاجر کے پاس چلے جائیں گے، لیکن جہاں لوگ مجبور ہوکر ایک ہی سے خریدیں تو وہاں رسد وطلب کی قوتیں مفلوج ہوجاتی ہیں، کام نہیں کرتیں اور اجارہ داریاں قائم ہوجاتی ہیں۔

لہٰذا جب لوگوں کو ہر قسم کے منافع کے حصول کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا تو انہوں نے اجارہ داریاں قائم کرلیں اور ان اجارہ داریوں کے نتیجے میں بازار کی قوتیں مفلوج ہوگئیں اور چند لوگ سارے سرمایے کی جھیل پر قابض ہوگئے، جو امیر ہے وہ امیر سے امیر تر ہوتا چلا جارہا ہے اور جو غریب ہے وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

دنیا کا مہنگا ترین بازار

امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں ایک دنیا کا مہنگا ترین بازار کہلاتا ہے، بیورلے ہلز کے علاقے میں وہاں مجھے ہمارے کچھ ساتھی لے گئے، ایک دکان دکھائی اور کہا کہ یہ دنیا کی مہنگی ترین دکانوں میں سے ہے، اس میں دیکھا کہ وہاں موزے ہیں، پہننے کی جرابیں ہیں، معلوم کیا قیمت کیا ہے؟ تو پتہ چلا کہ موزوں کی قیمت دو سو ڈالر ہے، دو سوڈالر کا مطلب تقریباً بارہ ہزار روپے کے موزے، آگے سوٹ لٹکا ہوا تھا، پوچھا یہ کتنے کا ہے؟ معلوم ہوا کہ کوئی سوٹ دس ہزار ڈالر کا ہے، کوئی پندرہ ہزار ڈالر کا ہے۔

اس کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ دکان کا جو نیچے کا طبقہ ہے اس میں تو آپ گھوم پھر کر دیکھ لیں، لیکن اوپر کے طبقے میں اس وقت تک نہیں جاسکتے جب تک مالک آپ کے ساتھ نہ ہو۔

مالک کو ساتھ لے کر اس لیے جاتے ہیں کہ وہ آپ کو مشورہ دے گا کہ آپ کے قدو قامت، آپ کی جسامت اور آپ کے رنگ وروپ کے حساب سے فلاں سوٹ آپ کے لیے مناسب ہوگا، وہ مشورہ دیتا ہے اور اس مشورہ کے دس ہزار ڈالر وصول کرتا ہے، صرف مشورہ دینے کے دس ہزار ڈالر اور مشورہ لینے کے لیے بھی پہلے اس سے وقت (Appointment) لینا پڑتا ہے اور اگر کوئی آدمی اپائنٹمنٹ لے تو چھ چھ مہینے کے بعد اپائنٹمنٹ ملتا ہے۔

برطانیہ کا شہزادہ چارلس جب امریکہ جانے والا تھا اس نے جانے سے پہلے اپائنٹمنٹ لیا تو اس کو ایک مہینے بعد کا اپائنٹمنٹ ملا کہ آپ ایک مہینہ بعد تشریف

لائیں تو آپ کو مشورہ دیں گے، تو دس ہزار ڈالر تو صرف مشورہ کے ہیں باقی سوٹ کی قیمت اس کے علاوہ ہے، یہ اس دکان کا حال ہے۔

امیر ترین ملک میں دولت وغربت کا امتزاج

وہاں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ٹرالیاں لیے پھر رہے ہیں، ان ٹرالیوں کے اندر کوکا کولا Cocacola سیون اپ 7-up، پیپسی کولا PepsiCola کے خالی ڈبے بھرے ہوئے ہیں، پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو پتہ چلا کہ یہ بیروزگار لوگ ہیں اور یہ ایسا کرتے ہیں کہ شہر میں جو سلۃ الضوائع ہوتی ہیں یعنی کوڑا کرکٹ کی جو ٹوکریاں لگی ہوتی ہیں، یہ ان میں سے ڈبے نکال کر علاقے کے کسی کباڑیے کے ہاں فروخت کرتے ہیں اور اسی پر گزارہ کرتے ہیں، ان کا کوئی گھر نہیں ہے، رات کو سڑک کے کنارے ٹرالی کھڑی کر کے اس کے نیچے سو جاتے ہیں اور جب سردی کا موسم آتا ہے اس وقت ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ہوتی، اس واسطے زیرِ زمین چلنے والی ٹرین کے اسٹیشنوں پر راتیں گزارتے ہیں، تو ایک میل کے فاصلے پر دولت کی ریل پیل اور اس کے ضیاع کا یہ حال ہے اور دوسری طرف غربت کی انتہاء کا یہ حال ہے۔

یہی حال فرانس کے دارالحکومت پیرس کا ہے، وہ فرانس اس وقت تجارت وصنعت وٹیکنالوجی کے اعتبار سے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا ہے، اس ملک میں ہزارہا آدمیوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے، یہ خرابی درحقیقت اس طریقے سے ہوئی کہ منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑا کہ جیسا مادر پدر آزاد چھوڑا جاتا ہے اور اسی سے امیر وغریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوئیں، تقسیم دولت

کا نظام ناہموار ہوا تو وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی پوری تصویر نظر آتی ہے، تو یہ فلسفہ ٹھیک تھا کہ کہ ذاتی منافع کے لیے لوگ کام کریں، لیکن اس طرح بے مہار چھوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے اجارہ داریاں قائم کرلیں۔

اسلامی معیشت کے احکام

اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھیک ہے بازار کی قوتیں بھی درست، انفرادی ملکیت بھی درست، ذاتی منافع کا محرک بھی درست، لیکن ان کو حرام وحلال کا پابند کیے بغیر معاشرے میں انصاف قائم نہیں ہوسکتا۔ اسلام کا اصل امتیاز یہ ہے کہ اس نے حلال وحرام کی تفریق قائم کی کہ نفع کمانے کا یہ طریقہ حلال ہے اور یہ طریقہ حرام ہے۔

اسلامی نظام نے دو قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں:

خدائی پابندیاں

پہلی قسم کو میں خدائی پابندیوں کا نام دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں، حلال وحرام کی پابندیاں۔ مثلاً: سود حرام ہے، قمار حرام ہے، بیع قبل القبض حرام ہے، اور اس کے علاوہ دیگر صورتیں جن کی تفصیلات ان شاء اللہ بیوع کے اندر آئیں گی وہ حرام ہیں، یہ پابندیاں لگادیں اور اگر ان پابندیوں پر غور کیا جائے (جو جیسے جیسے جہاں جہاں آئیں گی ان شاء اللہ عرض کروں گا) تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت یہ پابندیاں عائد فرمائی ہیں اور ایسے ایسے چور دروازوں پر پہرہ بٹھایا ہے جہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتیں شروع ہوتی ہیں اور اس سے فساد کے دروازے بند کردیے، یہ خدائی پابندیاں ہیں۔

حکومتی پابندیاں

بعض مرحلوں پر ایسا ہوتا ہے کہ جو خدائی پابندیاں عائد کی گئی ہیں، بعض لوگوں نے ان کی پروانہ کی اور ان کے خلاف کام کیا ہو یا معاشرے میں کچھ غیر معمولی قسم کے حالات پیدا ہوئے جس کے نتیجے میں وہ پابندیاں کافی نہ ہوسکیں تو معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اسلامی حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ کچھ مباحات پر بھی پابندیاں عائد کردی جائیں تاکہ معاشرے میں توازن برقرار رہے، یہ حکومتی پابندیاں ہیں۔

اصولِ فقہ کا ایک حکمِ امتناعی (سدِّ ذرائع)

اصولِ فقہ میں ''سدِّ ذرائع'' کے نام سے ایک مستقل باب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کام فی نفسہ جائز ہو، لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسدے کا سبب بن رہی ہو تو حکومت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس جائز کام کو بھی وقتی مصلحت کے تابع ہو کر وقتی حکم کے طور پر ممنوع قرار دے۔(۱)

اور اس قسم کی پابندیوں کے واجبُ التعمیل ہونے کا ماخذ قرآنِ کریم کا یہ ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۲)

---

(۱) اعلام الموقعین عن رب العالمین لابن القیم ۱۸۰/۳ فصل فی سد الذرائع۔طبع دار الکتب العلمیۃ۔

(۲) سورۃ النساء آیت (۵۹)۔

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔

مثلاً عام حالات میں بازار میں اشیاء کا نرخ مقرر کرنے کے لیے رسد وطلب کی قوتوں کو کام میں لانا چاہیے، لیکن جہاں کسی وجہ سے اجارہ داریاں قائم ہوگئی ہوں تو وہاں تسعیر (Control) کی بھی اجازت ہے، یعنی حکومت نرخ مقرر کردے اور یہ پابندیاں لگادے کہ فلاں چیز اس قیمت پر ملے گی، اس سے کم یا زیادہ پر نہیں۔

اس اصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کرسکتی ہے اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ان پر مناسب پابندی عائد کرسکتی ہے، ''کنز العمال'' [1] میں روایت منقول ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بازار میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کوئی چیز اس کے معروف نرخ سے بہت کم داموں میں فروخت کررہا ہے، آپ نے اس سے فرمایا کہ

''إما أن تزيد في السعر وإما أن ترفع من سوقنا'' [2]

یا تو دام میں اضافہ کرو، ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ۔

روایت میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے اس پر پابندی لگائی، ہوسکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ وہ متوازن قیمت سے بہت کم قیمت لگا

---

(۱) ۱۸۳/٤(۱۰۰۷۵) كتاب البيوع من قسم الافعال باب الاحتكار والتسعير. طبع موسسة الرسالة.

(۲) مصنف عبدالرزاق ۲۰٦/۸(۱٤۹۰۵) والسنن الكبرى للبيهقي ٤۸/٦(۱۱۱٤٦)۔

کر دوسرے تاجروں کے لیے جائز نفع کا دروازہ بند کر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی کی وجہ یہ ہو کہ کم قیمت پر مہیا ہونے کی صورت میں لوگ اسے ضرورت سے زیادہ خرید رہے ہوں جس سے اسراف کا دروازہ کھلتا ہو یا لوگوں کے لیے ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نکلتی ہو، بہر صورت قابلِ غور بات یہ ہے کہ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ملکیت کی چیز جس دام پر چاہے فروخت کرسکتا ہے، لہٰذا کم قیمت پر بیچنا فی نفسہٖ جائز تھا، لیکن کسی اجتماعی مصلحت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی عائد کی، لہٰذا یہ وہ پابندیاں ہیں جو حکومت عائد کرسکتی ہے۔

ان دو پابندیوں کے دائرے میں رہتے ہوئے بازار میں جو مقابلہ ہوگا وہ آزاد مقابلہ ہوگا (Free Competition)، آزاد مقابلے کے نتیجے میں واقعتاً رسد وطلب کی قوتیں کام کریں گی اور اس کے نتیجے میں درست فیصلے ہوں گے۔

تو سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی فلسفہ اگرچہ غلط نہیں تھا، لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے دو بنیادی اصول مقرر کیے گئے۔

ایک یہ کہ ذاتی منافع کمانے کے لیے لوگوں کو بالکل آزاد چھوڑ دو، دوسرا یہ کہ حکومت کی عدمِ مداخلت (حکومت بالکل مداخلت نہ کرے)، اگرچہ اب سرمایہ دارانہ نظام کے بیشتر ممالک میں حکومت کی عدمِ مداخلت والے اصول پر عمل نہیں ہے، ہر ملک نے کچھ نہ کچھ پابندیاں لگائی ہوئی ہیں، لیکن چونکہ وہ پابندیاں اپنے دماغ سے گھڑی ہوئی ہیں اس لیے ان کا وہ اثر نہیں ہے جو خدائی پابندیوں کا ہوتا ہے، یہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام سے ممتاز کرتا ہے۔

یہ تینوں نظاموں کے مابہ الامتیاز کا خلاصہ ہے، اگر یہ ذہن میں رہے تو کم از کم بنیادی اصول ذہن میں واضح رہیں گے، باقی تفصیلات ان شاء اللہ مختلف ابواب میں آئیں گی۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت نے چوہتر (۷۴) سال میں دم توڑا اس کی وجہ نہیں ہے کہ وہ نظام بذاتِ خود غلط تھا یا خراب تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ پیش آئی کہ جو اصل نظام تھا اس پر عمل میں کوتاہی کی گئی جس کے نتیجے میں وہ تباہ ہوا، بعض لوگ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان ایک عرصے تک دنیا میں حکمران رہے اور بعد میں ان پر زوال آیا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے معاذ اللہ کہ اسلام ناکام ہو گیا تو یہ غلط ہے، اس لیے کہ حقیقت میں اسلام ناکام نہیں ہوا، بلکہ اسلام کی تعلیمات کو چھوڑنے پر زوال آیا۔ تو اشتراکیت والے بھی یہ کہتے ہیں کہ جو اصل نظام تھا اس کو چھوڑنے کے نتیجے میں زوال آیا ورنہ فی نفسہ وہ نظام غلط نہیں تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات آیا کہ یہ زوال اصل نظام کو چھوڑنے سے آیا یا اصل نظام کو اختیار کرنے کے باوجود آیا، اس کا فیصلہ بڑا آسان ہے۔

اشتراکیت ایک معاشی نظام ہے، سوال یہ ہے کہ اشتراکیت کے جو بنیادی اصول تھے ان کو کس مرحلے پر اور کہاں چھوڑا گیا تھا؟ اشتراکیت کے دو اصول قومی ملکیت اور منصوبہ بندی کسی دور میں نہیں چھوٹے، چاہے وہ لینن کا دور ہو، اسٹالن کا دور ہو یا گورباچوف کا دور ہو۔ یہ دو اصول ہر جگہ برقرار رہے ہیں کہ

ساری پیداوار قومی ملکیت میں اور معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کے ذریعے طے ہوں۔

اب زوال جو آیا وہ اس بنا پر کہ اس کے نتیجے میں جو ملکی پیداوار گھٹی، پیداوار گھٹنے کے نتیجے میں لوگوں کے اندر بے روزگاری پھیلی اور لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

گورباچوف جو سویت یونین کا آخری سربراہ تھا، اس نے تعمیرِ نو کے نام سے ایک تحریک چلائی، اس کی کتاب بھی چھپی ہوئی ہے، اس نے تھوڑی سی کوشش کی کہ قوم تباہ ہورہی ہے اور اس تباہی سے بچنے کے لیے تھوڑی سی لچک دکھانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو تھوڑا سا تجارت کی طرف لایا جائے تاکہ معاشی سرگرمیوں میں دوبارہ جان پیدا ہو، لیکن اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اس کو بروئے کار لاتا، اگر اصولوں سے انحراف ہوتا تو وہ گورباچوف کے زمانے میں ہوتا کہ جب اس کا اس طرف میلان ہوا تھا کہ ہم بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائیں، لیکن ابھی وہ نہیں کر سکا تھا کہ خود لوگوں نے ہی بغاوت کر دی یہاں تک کہ قصہ ہی ختم ہو گیا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اصل اصولوں کو چھوڑنے کی وجہ سے زوال آیا یہ اس وجہ سے درست نہیں کہ جو بنیادی اصول تھے، ان پر وہ اوّل سے آخر تک کاربند رہے اور انہی کے نتیجے میں جو دیکھا وہ دیکھا۔

رہی یہ بات کہ واستبداد کا نظام تھا اور ہم نے جمہوریت لانے کی کوشش کی، ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ بھی جمہوریت کا تابعدار تھا، وہ بھی جمہوریت چاہتا تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ جمہوریت، یعنی مزدوروں کی قائم کردہ جمہوریت لینن کے دور

میں بھی ایک جماعتی نظام تھا جو آخر تک رہا۔

لٰہذا یہ کہنا کہ ہم اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے نتیجے میں زوال کا شکار ہوئے ہیں، یہ غلط ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اصولوں کو اپناتے رہے اور اسی کے نتیجے میں زوال آیا۔

مخلوط معیشت کا نظام (Mixed Economy)

بعض ممالک میں ایک تصور پیدا ہوا ہے جس کا نام مخلوط معیشت ہے۔ جس میں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی بازار کی قوتوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں کچھ منصوبہ بندی بھی شامل کی گئی، مثلاً کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قومی ملکیت میں ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آزاد ملکیت میں ہیں۔ جو قومی ملکیت میں ہوتی ہیں ان کو پبلک سیکٹر (Public Sector) کہتے ہیں، مثلا پانی، بجلی، ٹیلیفون اور ائیر لائنز وغیرہ، ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہے کہ یہ سب قومی ملکیت ہیں، بعض ذاتی ملکیت (Private Sector)، تو بہت سے ملکوں میں مخلوط معیشت کا نظام چل رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا جو بنیادی اصول تھا، یعنی عدم مداخلت، اس پر تو اب شاید کوئی بھی سرمایہ دارانہ ملک قائم نہیں رہا، ہر ایک نے کچھ نہ کچھ مداخلت کی ہے، کسی نے کم کسی نے زیادہ، اسی کو مخلوط معیشت (Mixed Economy) کہا جاتا ہے۔ اور وہ مداخلت اپنی عقل کی بنیاد پر ہے، وہ مداخلت کیا ہے؟ کہ پارلیمنٹ (Parlement) جو پابندی عائد کرے وہ عائد کی جائے گی۔ یعنی پارلیمنٹ کی اکثریت جس کے حق میں ووٹ دے دے وہ پابندی عائد کر دی

جائے گی اور پارلیمنٹ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جوخود سرمایہ دار ہیں، وہ پابندیاں عائد تو ضرور کرتے ہیں لیکن وہ پابندیاں متعصّبانہ ہوتی ہیں اور کوئی غیر جانبدارانہ پابندی عائد نہیں ہوتی اور اس کے نتیجے میں جوخرابیاں اور ناہمواریاں ہوتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں۔ کسی خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا گیا جو انسانی سوچ سے ماوراء ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے اور اس کے تحت پابندی عائد کی گئی ان میں سے خرابیاں زائل نہیں کیں۔

اگر خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، اللہ تبارک وتعالی کی حاکمیت مطلقہ کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا تو اس وقت تک افراط وتفریط میں مبتلا رہیں گے، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے اس کے تحت کاروبار کو چلایا جائے۔

یہ مختصر سا خلاصہ ہے جس میں تینوں نظاموں کا فرق بتایا گیا ہے اور آج کل کی معاشیات کے متعلق کتابیں لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور ان سے خلاصہ نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ہزار ہا صفحات کی ورق گردانی کے نتیجے میں جو خلاصہ اور مغز حاصل ہوتا ہے وہ میں نے آپ کو ان تقریروں میں عرض کر دیا ہے، جس سے کم از کم کچھ تھوڑے سے بنیادی معالم تینوں نظاموں کے سمجھ میں آجائیں۔ باقی تفصیل مختلف ابواب واحادیث کے ماتحت آجائے گی، اپنے اپنے مقام پر بیان ہوگا، اس کے اندر اور زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ذکر ہوگا ان شاءاللہ تعالی۔
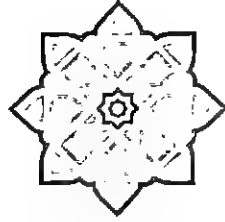
امتِ مسلمہ کی معیشت
اور
اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امتِ مسلمہ کی معیشت اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد

"اکیسویں صدی اور مسلم امہ" کے موضوع پر "مؤتمر العالم الإسلامی" نے اسلام آباد میں ۲۳ ستمبر 1997 کو ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں شیخ الاسلام جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کو مذکورہ بالا موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی، حضرت نے اس موقع پر انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا، اس مقالے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔(ترجمہ ڈاکٹر عمران اشرف عثمانی صاحب کا ہے)

محترم چیئرمین اور معزز مہمان گرامی!

یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ایسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع مل رہا ہے جو مؤتمر العالم الاسلامی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک وقت میں منعقد کر رہی ہے، نئی صدی کا ظہور پورے عالمِ اسلام

میں فکر وعمل کے نئے افق کھول رہا ہے، ہمارے لیے مسلم امہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اہم مسائل اور مشکلات پر غور کرنا، ان کے رخ متعین کرنا اور آنے والے وقتوں کے بین الاقوامی مسائل کے حل کرنے کے لیے اپنی حکمتِ عملی وضع کرنا ایک لائقِ تحسین عمل ہے، میں مؤتمر العالم الاسلامی کا شکر گزار ہوں کہ مجھے ایسا پر وقار فورم (Forum) مہیا کیا جس میں میں ان مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔

انیسویں صدی سیاسی استبداد کی صدی تھی، جس میں یورپی طاقت اور اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک بشمول اسلامی ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا، موجودہ صدی نے جواب اپنے آخری سانس لے رہی ہے مغربی استعمار کی طرف سے آزادی کے تدریجی عمل کا مشاہدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی وہ صدی تھی جس میں بہت سے اسلامی ممالک نے یا تو طاقت کے بل بوتے پر یا پر امن طریقوں سے آزادی حاصل کی، تاہم اپنی سیاسی آزادی کے حصول میں واضح کامیابی کے باوجود ہم اب تک علمی، معاشی اور منصوبہ سازی کے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ اب تک مسلم امہ سیاسی آزادی کے صحیح ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہو سکی۔

اب مسلم دنیا نئی صدی کو اس امید کے ساتھ دیکھ رہی ہے کہ ان شاء اللہ یہ اس کے لیے مکمل اور حقیقی آزادی لے کر آئے گی، جس میں مسلمان دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں اور قرآنِ کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ امید صرف خوابوں اور خواہشات سے پوری نہیں ہوسکتی، اپنے اس محبوب مقصد کے حصول کے لیے ہمیں اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے رویہ کو بدلنا ہوگا اور جس قدر ہم نے سیاسی آزادی کے حصول کے لیے کوششیں کیں اس سے زیادہ ہمیں اپنی مکمل آزادی کے حصول کی کوششیں کرنی ہوں گی، ہمیں اپنے لائحہ عمل اور منصوبوں پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا، ہمیں خوب غور وفکر کے ساتھ مرتب کردہ پلاننگ اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہوگی، ہمیں اپنے متعین اور واضح مقاصد کے لیے اجتماعی قوتِ ارادی، انقلابی اقدامات اور ایک پر جوش پروگرام کی ضرورت ہوگی، اور اس طرح کے بین الاقوامی سیمیناروں سے اگر بھر پور فائدہ اٹھایا جائے تو اس مقصد کی طرف سنجیدہ فکر کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

جس موضوع کے بارے میں مجھ سے اس عظیم فورم میں چند الفاظ پیش کرنے کے لیے کہا گیا وہ موضوع ''امت مسلمہ کی معیشت کا اسلامی خطوط پر اتحاد'' ہے، اس مختصر مضمون میں جو ایک مختصر نوٹس پر تیار کیا گیا ہے احقر اپنے آپ کو ایسے دو نکات تک محدود رکھے گا جو ہمارے لیے امتِ مسلمہ ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

(۱) خود ساختہ انحصار

یہ بات ہر کس وناکس جانتا ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کا سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسروں پر انحصار اس امت کا ایسا معاشی مسئلہ بن چکا ہے، جس سے آج تمام مسلم امت دوچار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلم ممالک

مغربی ممالک یا بین الاقوامی (بلکہ حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو مغربی) مالیاتی یا تمویلی اداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے رہے ہیں اور بعض ممالک یہ بھاری مقدار میں سودی قرضے کسی ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنے روز مرہ کے اخراجات کے لیے لے رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک امر یہ ہے کہ اپنے سابقہ سود کی ادائیگی کے لیے حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کے حاصل کردہ قرضوں کا سائز خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

بیرونی قرضوں پر انحصار ہماری ایک ایسی بنیادی بیماری ہے جس کی وجہ سے ہماری اقتصادی زندگی اس درجہ متاثر ہوچکی ہے کہ قومی خود اعتمادی تقریباً مفقود ہوتی جارہی ہے اور اس نے ہمیں اس بات پر مجبور کر رکھا ہے کہ ہم اپنے قرض دہندوں کے مطالبات کے آگے، بلکہ بعض اوقات ایسے مطالبات کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں جو ہمارے اجتماعی مفادات کے خلاف ہیں، یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ قرض دہندہ قرض دینے سے قبل مقروض پر اپنی شرائط عائد کردیتے ہیں، یہ شرائط ہمیں مستقل غیر ملکی دباؤ میں رکھتی ہیں اور اکثر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد کے حصول سے روکتی ہیں اور اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اغیار کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، خلاصہ یہ کہ غیر ملکی قرضوں کے برے نتائج اتنے واضح ہیں کہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

قرضہ لینا اسلامی تعلیمات کی رو سے اس قدر ناپسند فعل ہے کہ اس میں شدید مجبوری اور سخت ضرورت کے بغیر مبتلا نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے بھی ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نمازِ جنازہ ادا

کرنے سے انکار فرمادیا جو اپنا قرض ادا کیے بغیر وفات پا گیا تھا۔[1]

مزید برآں مسلمان فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا کسی مسلمان ملک کے حکمران کے لیے جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش کردہ تحفے قبول کرے؟

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ جب ان تحفوں کی وجہ سے امتِ مسلمہ کے مفاد کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ہو، یہ جواب تحفے قبول کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے، اب آپ اس سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرضے لینے کا جواب کیا ہوگا؟

اسلامی اصولوں کے مطابق بیان کردہ یہ ہدایات اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ مسلمان کو اپنی سختی اور تنگی کے زمانے میں بھی غیر ملکی قرضے لینے سے انکار کرنا چاہیے، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ موجودہ قرضے ہمارے وسائل (Resources) کی قلت کے باعث پیدا نہیں ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی جتنے مالدار آج ہیں اس سے قبل کی پوری تاریخ میں اتنے مال دار کبھی نہیں رہے۔ آج ان کے پاس قدرتی وسائل کے عظیم خزانے موجود ہیں، دنیا کے اہم دفاعی واقتصادی اہمیت کے حامل مقامات ان کے قبضے میں ہیں، وہ دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہیں، وہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایسی جغرافیائی زنجیر میں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سوائے اسرائیل اور ہندوستان کے کوئی ملک حائل نہیں ہے، وہ دنیا کا تقریباً پچاس فی صد تیل پیدا کرتے ہیں، دنیا کی خام مال کی برآمدات میں تقریباً چالیس فی صد حصہ مسلمانوں کا شمار کیا جاتا ہے، ان تمام

---

(۱) صحیح البخاری ۹۴/۳ (۲۲۸۹)۔

حقائق کے علاوہ مسلمانوں کی وہ تمام نقد رقوم جو مغربی ممالک میں امانت یا سرمایہ کاری کی غرض سے رکھی گئی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر عائد تمام دیون (Loans) اور واجبات (Payables and dues) کی ادائیگی کے لیے مکمل کافی ہیں۔

اسلامی ترقیاتی بینک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) کے رکن ممالک کے بیرونی قرضہ جات کا مجموعہ 618.8 بلین ڈالر ہے، جب کہ دوسری طرف مسلمانون کے مغربی ممالک میں رکھے ہوئے اثاثے اور امانتیں (Deposits) اس سے کہیں زیادہ ہیں، یہ بات ظاہر ہے کہ اثاثوں اور امانتوں کا کوئی ٹھوس ریکارڈ نہیں ہے، کیونکہ ان کے مالکان متعدد وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر نہیں کرتے، البتہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ خلیج کی جنگ (Gulf War) کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنے ۲۵۰ بلین ڈالر نکال کر اپنے ممالک میں جمع کرائے تھے، ان کے علاوہ مسلمانوں کے مغربی ممالک میں جمع شدہ اثاثوں اور امانتوں کا تخمینہ ۸۰۰ سے لے کر ۱۰۰۱ بلین ڈالر کے درمیان ہے، اس بات کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ہی جمع کردہ رقم کا ایک حصہ خود ہی زیادہ سودی قیمت پر قرض لے رہے ہیں۔

اور اگر بالفرض ان تخمینی اعداد وشمار کو مبالغہ آمیز سمجھا جائے تب بھی اس حقیقت سے شاید ہی کوئی منکر ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی رقموں کو اگر اپنے پاس ہی رکھ کر صحیح طریقے سے مسلمان دنیا پر استعمال کیا جاتا تو امتِ مسلمہ کبھی چھ سو بلین یا اس سے زائد قرضے لینے پر مجبور نہ ہوتی۔

اس زاویے سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی قرضوں پر

انحصار درحقیقت ہمارا خود ساختہ ہی ہے، جس کے بارے میں ہم کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتے، ہم نے کبھی بھی ان عوامل کو دور نہیں کیا جو ہمارے سرمائے کی باہر منتقلی کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم نے اپنے آپ کو موجودہ ظالمانہ اور بدعنوان (Corrupt) نظامِ محصولات سے چھٹکارا نہیں دیا، ہم کبھی سرمایہ کاری کے لیے ایک پرامن فضا قائم کرنے کے قابل نہیں ہوئے، ہم نے کبھی اپنے ممالک کو ایک مضبوط سیاسی نظام عطا نہ کیا۔ ہم نے کبھی بھی اپنے مجموعی سرمایہ سے بہترین طریقوں سے استفادہ کرنے کے موقع پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، مزید برآں مجموعی طور پر ہم اسلامی اتحاد کے جذبات کو سرگرم اور امتِ مسلمہ کی طاقت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے۔

یہ افسوس ناک صورتِ حال نئی صدی کی خوشی میں مہنگی تقریبات منعقد کرلینے سے ٹھیک نہیں ہوسکتی، ہمیں سنجیدگی کے ساتھ وقت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ ہمارے معاشی اور سیاسی قائدین کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلانے کے لیے ایسے ذرائع اور طریقے تلاش کرنے ہوں گے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے دستیاب ہیں، جس چیز کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم امہ کے باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے نئی پالیسیاں وضع کریں۔

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱)

تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

قرآن وسنت کی تعلیمات اور احکام اس اصول کی تائید کرتے ہیں کہ تمام مسلم امہ کو یک جان ہو کر کام کرنا چاہیے، جغرافیائی حدود انہیں مختلف مقاصد اور مختلف اقوام میں منقسم نہیں کرسکتیں، سیاسی وجغرافیائی حدود صرف کسی ملک کے انتظامی وداخلی امور نمٹانے کے لیے برداشت کی جاسکتی ہیں، لیکن تمام مسلم ممالک کو خصوصاً ان کے اپنے مشترک مقاصد کے لیے بقیہ دنیا کے مقابلے میں یک جان اور یک رخ ہوکر سوچنا چاہیے۔

اب وہ دن چلے گئے جب تکنیکی مہارت پر صرف چند مغربی ممالک کی اجارہ داری تھی، اب مسلمانوں کی مہارت اور قابلیت (Talent) کم از کم مسلمانوں کی فوری ضروریات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس امت کی خدمت کے لیے مذہبی جذبہ کے ساتھ اس قابلیت کو تلاش کریں، لیکن یہ مقصد ہمارے ممالک کے قائدین اور زعماء کی متحدہ کوششوں کا طلب گار ہے، یہی اس کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کا مقابلہ ان کے لیے نہ صرف امت کی بھلائی کی خاطر، بلکہ خود اپنی بقاء اور حیات کے لیے ضروری ہے، اس بارے میں ایک عظیم ذمہ داری آرگنائزیشن آف اسلام کانفرنس (OIC) کے کاندھوں پر ہے کہ اسے خود آگے بڑھ کر مسلمان قابلیت کا ایک متحدہ تالاب (Pool) بنانا ہے۔

---

(۱) سورۃ الحجرات آیت (۱۰)۔

(۲) اپنے معاشی نظام کی تعمیرِ نو

دوسرا اہم نکتہ جس کی طرف احقر حاضرینِ مجلس کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے۔

بیسویں صدی سوشلزم کا ظہور، سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان محاذ آرائی اور آخر میں سوشلزم کے سقوط کا مظاہرہ دیکھ چکی ہے۔ مغربی سرمایہ دار ممالک سوشلزم کے سقوط کی اس طرح خوشیاں منارہے ہیں گویا یہ ان کی نہ صرف سیاسی، بلکہ فکر ونظر کی فتح کا حقیقی ثبوت ہے، اسی طرح وہ کمیونسٹ تصوّرات کے سقوط کو بھی سرمایہ داری نظریے کی حقانیت کا بیّن ثبوت قرار دے رہے ہیں اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ سرمایہ دارنہ نظام ہی اب انسانیت کے لیے ایسا واحد نظام ہے جسے اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے ظالمانہ اصولوں اور خصوصاً دولت کی غیر مساوی تقسیم کے ردِعمل کے طور پر ابھرا تھا جو گزشتہ کئی صدیوں سے سرمایہ دار ممالک میں نظر آرہی تھی۔ سوشلزم ان برائیوں کی نشاندہی کرنے اور معاشرے پر ان کے برے اثرات کی تنقید کرنے میں حق بجانب تھا۔ سوشلزم کی ناکامی کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام پر صحیح تنقید نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ خود اس کے پیش کردہ متبادل نظام کے اندر موجود خرابیاں تھیں، لہٰذا سوشلزم کی ناکامی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر کوئی خرابی نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ خرابیاں ابھی تک موجود ہیں اور ان کی اصلاح بھی نہیں کی گئی، جو ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کررہے ہیں وہ ابھی تک دولت کی غیر مساوی تقسیم میں مبتلا ہیں، مالداروں اور غیر مالداروں کے درمیان عظیم فرق

اور دولت کے عین درمیان غربت (Poverty in the midst of plenty) ان کے نظامِ معیشت میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، یہی سرمایہ دارانہ نظام کے حقیقی مسائل ہیں جنہیں اگر صحیح طرح حل نہیں کیا گیا تو یہ ایک اور ردعمل جنم دے سکتے ہیں، جو سوشلزم سے کہیں زیادہ سخت اور ظالم ہوگا۔ سوویت یونین کے سقوط اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ بعض وسط ایشیائی ریاستیں دوبارہ کمیونزم کی طرف رخ کر رہی ہیں، یہ حقیقت اس پارلیمانی انتخابات کے نتائج سے اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے جس میں کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی اپنی پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت سے سیٹیں حاصل کی ہیں، یہ اس وجہ سے نہیں کہ کمیونزم یا سوشلزم کے پاس واقعتاً کوئی فضیلت یا اچھائی موجود ہے، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے برے نتائج اور غیر مساویانہ تقسیم دولت کا دوبارہ ردِعمل ہے۔

اسی لیے اب دنیا ایک تیسرے نظام کی شدید محتاج ہے جو اسے ان دونوں نظامہائے معیشت کی ان خرابیوں سے نجات دلائے، جن سے انسانیت گزشتہ چند صدیوں سے دو چار رہی ہے، اسی تیسرے نظام کے لیے مسلم امہ کی طرف سے اسلامی خطوط پر کام کیا جاسکتا ہے، وہ معاشی اصول جو قرآنِ پاک اور احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ماخوذ ہیں آج کی دنیا کے تمام معاشی مسائل کو حل کرنے میں کافی وشافی ہیں، کیونکہ اسلام جہاں ذاتی ملکیت اور بازاری معیشت کی اجازت دیتا ہے وہاں ایک منصفانہ تقسیمِ دولت کا ایک سوچا سمجھا نظریہ بھی پیش کرتا ہے، جو معاشی زندگی کی ناہمواریوں سے نجات بھی دلاتا ہے اور ایک ایسا نظام پیدا کرتا ہے جس میں ذاتی منافع کا محرک (Motive of personal profit) معاشرے کے مجموعی مفاد کے ساتھ شیر وشکر ہو کر چلتا ہے، سوشلزم کی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ

سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور غیر مساویانہ تقسیم سے مایوس لوگوں نے ذاتی ملکیت کے حقیقی تصوّر اور بازاری قوتوں پر حملہ کرکے ایک ایسے معاشی نظام کا مفروضہ پیش کیا جو بالکل غیر حقیقی، مصنوعی اور جابرانہ تھا، ذاتی ملکیت کی آزادی کے انکار نے پیداواری جذبے کو نہ صرف ختم کردیا، بلکہ وسیع ریاستی طاقت نے عوام کی قسمت حکمران طبقے کے ہاتھ میں دے دی۔

تجربات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ ذاتی ملکیت سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کی بنیادی وجہ تھی نہ بازار کی قوتیں، بلکہ سرمایہ دار ممالک میں معاشی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی بنیادی وجہ ذاتی منافع کے بے لگام استعمال اور جائز وناجائز کمائی کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار کا فقدان تھا، جس نے تمام دولت کو چند مال دار لوگوں تک محدود کردیا۔ سود، قمار، جوئے اور غیر اخلاقی خواہشات کی تکمیل جیسے طریقوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی سرمایہ دارانہ نظام میں اجازت دی گئی، جس نے مارکیٹ میں اجارہ داری (Monopoly) کا رجحان پیدا کردیا، جس کے نتیجے میں طلب ورسد کی طاقتیں یا تو بالکل مفلوج ہوکر رہ گئیں یا ان کے عمل کو اپنے بھرپور اثر سے روک دیا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظریہ ایک طرف تو طلب ورسد کو سرگرم کرنے کے لیے اصول عدمِ مداخلت (Laisez fair) کا اعلان کرتا ہے تو دوسری طرف مندرجہ بالا غلط ذرائع کاروبار کی اجازت دے کر ان کی قدرتی عمل میں مداخلت کرتا ہے، سرمایہ دار ایسی اجارہ داریاں (Monopolies) پیدا کر کے اپنے جابرانہ فیصلے عوام الناس کی اکثریت پر مسلط کردیتے ہیں، جس کی وجہ

سے بازاری طاقتوں کو ان کا حقیقی کردار ادا کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ سود کا مستقل رجحان یہ ہے وہ مال دار صنعت کاروں کے لیے کام کرے، کیونکہ یہ صنعت کار ہی اس دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو غریب عوام بینکوں میں اپنی بچتوں کی صورت میں جمع کراتے ہیں اور جب انہیں عظیم فائدہ ہوتا ہے تو وہ عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کے مد میں قیمتوں میں اضافہ کرکے وصول کرلیتے ہیں۔ مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مال دار لوگ کھاتہ داروں (Depositres) کی رقموں کو اپنے نفع کے لیے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت میں ان (Depositres) کو کچھ ادا نہیں کرتے، کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں وہ صارفین جیسے عوام الناس سے ان کی پیداواری قیمت میں اضافہ کرکے واپس وصول کرلیتے ہیں۔

اسلام نہ صرف بازاری طاقتوں کو قبول کرتا ہے، بلکہ ان کو ایسی میکانیت (Mechanism) مہیا کرتا ہے جس کی وجہ وہ اجارہ داریوں کی رکاوٹوں کے بغیر اپنی طاقت کے ساتھ عمل جاری رکھتے ہیں۔ صحت مند پیداوار اور مساویانہ تقسیم کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے اسلام معاشی سرگرمیوں پر دو طرح کے کنٹرول عائد کرتا ہے۔

پہلی قسم کے کنٹرول سے اسلام نے تجارت اور کمائی کے عمل کو کچھ ایسے مخصوص اور پروقار طریق ہائے کار کے ساتھ متعین کردیا ہے جو بالکل وضاحت کے ساتھ حلال وحرام کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ یہ طریقے اجارہ داریوں کو روکنے اور غلط اور غیر اخلاقی کمائی اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کے خلاف

تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جدید اقتصادی ضروریات کے سیاق میں جہاں عام لوگوں کی بچتیں ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اسلامی طریق ہائے تمویل مثلاً سود کے بجائے مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال عوام کو ترقی کے پھل میں بلاواسطہ شریک اور حصہ دار بناتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک متوازن طریقے سے خوشحالی آتی ہے اور امیر وغریب کے درمیان فرق کم سے کم ہوجاتا ہے۔

دوسرے قسم کا کنٹرول زکوۃ وصدقات اور کچھ دوسری مالیاتی ذمہ داریاں عائد کرنے کے ذریعے عمل میں لایا گیا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی بھی دوبارہ ایسے لوگوں میں تقسیم کی جائے جو تجارت کے بھرپور مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اپنی ضروریات کے لیے نہیں کماسکتے۔ خلاصہ یہ کہ دولت کو مستقل گردش اور پھیلاؤ میں رکھنے کے لیے اور دولت کو محدود ومرکوز کرنے کے مواقع ختم کرنے کے لیے غلط اور ناجائز آمدنی کے راستے مسدود کردیے گئے اور زکوٰۃ، صدقات اور وراثت کے ضابطے وضع کیے گئے۔

چونکہ موجودہ صدی میں دنیا سوشلزم کا زوال اور سقوط بھی دیکھ چکی ہے اور سرمایہ دارنہ نظام کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کے زخم بھی ابھی تک مندمل نہیں کرپائی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ دنیا کو قرآن وسنت سے مستنبط اصول واحکام کی طرف دعوت دے، جو دو انتہاؤں کے درمیان ایک پرامن اعتدال فراہم کرتے ہیں، لیکن ہمارے لیے ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام کے اصول ابھی تک صرف نظریاتی ہیں جو ابھی تک عملی شکل میں ہمارے سامنے نافذ نہیں۔ یہاں تک کہ مسلمان ممالک نے بھی ابھی

تک اپنی معیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی ہے، ان میں سے اکثر اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں اور وہ بھی ایسے ناپختہ اور ادھورے طریقوں پر جن کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے اور بدقسمتی سے واضح اسلامی اصولوں کی موجودگی کے باوجود مسلمان ممالک میں معاشی ناہمواری اور عدمِ مساوات مغربی ممالک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ افسوس ناک صورت حال ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی، اگر ہم اپنے راستوں اور طریقہ کار کی اصلاح پر توجہ نہیں دیں گے تو انقلاب اور ردعمل کی جانب فطری عمل اپنے راستے ڈھونڈنے پر مجبور ہوجائے گا، اگر ہم ایسے انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشی نظام کو قرآن وسنت سے مستنبط اور ماخوذ واضح معاشی نظام پر از سرِ نو استوار کرنا پڑے گا، اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی نظام نافذ کرنے کے قابل ہوگئے تو نئی صدی کی آمد کے موقع پر یہ ہماری طرف سے انسانی برادری کے لیے ایک بہترین اور عظیم تحفہ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ اگر ہم اسلامی معیشت کے اصولوں کو اخلاص کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نافذ کردیں تو آج ہم بقیہ دنیا کو بھی پہلے کی بہ نسبت اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ کر پائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائیں اور اس پر عمل کرنے توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

سود کی حرمت

(تقریرِ ترمذی: ۱/۳۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سود کی حرمت

نحمدہ ونصلّی ورسولہ الکریم

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: «لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا ومؤکلہ وشاھدیہ وکاتبہ»(۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، سودی معاملہ میں گواہ بننے والے اور سود کا معاملہ لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے، اس حدیث سے پتہ چلا کہ جس طرح سود کا معاملہ کرنا ناجائز اور حرام ہے اسی طرح سود کے معاملے میں دلّالی کرنا یا سود کا حساب کتاب لکھنا بھی ناجائز ہے۔ اسی حدیث کی بنیاد پر یہ فتوی دیا جاتا ہے کہ آج کل بینکوں کی ملازمت جائز نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی کسی نہ کسی درجے میں سود کے معاملات میں ملوث ہوجاتا ہے۔

(۱) صحیح مسلم ۳/۱۲۱۸(۱۵۹۷) وسنن الترمذی ۲/٤۹٦(۱۲۰٦)۔

وکاتبہ

اس کی تفصیل میں حافظ ابن حجر [1] نے یہ لکھا ہے کہ کاتبِ سود سے مراد وہ شخص ہے جو کہ عقد کے وقت سود وغیرہ کا حساب لکھ کر عاقدین کی اس عقد میں معاونت کرتا ہے، وہ اس وعید میں داخل ہے، لیکن اگر کوئی شخص عقدِ سود کے انعقاد کے وقت یہ حساب کتاب نہیں لکھتا، بلکہ عقد کے بعد جب وہ پچھلے عرصے کے تمام حسابات اور کارگزاری اور رپورٹیں وغیرہ لکھتا ہے گو اس کے ذیل میں اسے سود کے حسابات بھی لکھنے پڑتے ہیں، غرض یہ کہ اس حساب کتاب سے عقدِ سود میں معاونت نہیں ملتی، تو وہ شخص اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔ اگر اس تفصیل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس سے ان حضرات کی الجھن دور ہوسکتی ہے جن کا کام اکاؤنٹ اور آڈٹ وغیرہ کا ہے، ان لوگوں کو مختلف فرموں، اداروں اور کمپنیوں کے پورے سال کے حسابات لکھنے پڑتے ہیں اور اس کی چیکنگ کرنی ہوتی ہے، اس میں انہیں سود وغیرہ جس کا کمپنی نے عقد کیا ہوتا ہے اسے بھی لکھنا پڑتا ہے، لیکن ان کا یہ لکھنا محض ایک سالانہ رپورٹ اور کارگزاری کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے کمپنی کی سودی لین دین میں کوئی معاونت نہیں ہوتی، لہٰذا یہ حضرات اس وعید میں داخل نہیں ہوں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

بینک کی ملازمت کیوں ناجائز ہے؟

البتہ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ بینک کی ملازمت کیوں حرام ہے؟ اس

---

(۱) ملاحظہ ہو فتح الباری شرح صحیح البخاری لابن حجر ۳۱۴/۴ باب آکل الربوا وشاہدہ وکاتبہ۔

لیے کہ آج کل تو ہر جگہ سے پیسہ بینک ہی کے واسطے سے آتا ہے، کوئی بھی چیز سود سے پاک نہیں، لہٰذا پھر تو ہر چیز حرام ہونی چاہیے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہر چیز کی حد مقرر کردی ہے کہ اس حد تک جائز ہے اور اس حد کے آگے ناجائز ہے، لہٰذا بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینک کے اندر سودی لین دین ہوتا ہے اور جو شخص بھی بینک میں ملازم ہے وہ کسی نہ کسی درجے میں سودی لین دین میں تعاون کررہا ہے اور کسی بھی گناہ کے کام میں تعاون کرنا قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے، فرمایا:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَان [1]

اس وجہ سے بینک کی ملازمت حرام ہے، جہاں تک اس اشکال کا تعلق ہے کہ ہر پیسہ بینک ہی کے واسطے سے ہم تک پہنچتا ہے، لہٰذا ہر پیسہ حرام ہونا چاہیے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بینک سے پیسے جائز اور حلال طریقے سے آرہے ہیں تو ان پیسوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر ناجائز اور حرام طریقے سے آرہے ہیں تو ان کا استعمال بھی حرام ہوگا۔

ربوا القرآن اور ربوا الحدیث

لفظ ''الربوا'' لغت میں زیادتی کے معنی میں آتا ہے[2] اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا اطلاق پانچ قسم کے معانی کے لیے ہوا ہے، لیکن زیادہ تر اس

---

(۱) سورۃ المائدۃ آیت (۲)۔

(۲) تاج العروس للزبیدی ۱۱۷/۳۸ مادہ ربو۔ طبع دار الھدایۃ۔

کا استعمال دو معنوں کے لیے ہوا ہے، ایک ''ربوا النسیئة'' کے لیے اور دوسرے ''ربوا الفضل'' کے لیے، ''ربوا النسیئة'' کی تعریف یہ ہے کہ

هو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض

اس کو ربوا القرآن بھی کہتے ہیں اور ''ربوا الفضل'' کی تعریف یہ ہے کہ دو ہم جنس چیزوں کے آپس میں تبادلے کے وقت کمی زیادتی کرنا، اس کو ''ربوا الحدیث'' بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ پہلی قسم کے ربا کو قرآنِ کریم نے اور دوسری قسم کے ربا کو حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔[1]

سود مفرد اور سود مرکب دونوں حرام ہیں

بعض لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے صرف سود مرکب کو حرام قرار دیا ہے، سود مفرد کو حرام نہیں کہا اور قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً[2]

اس آیت میں ربا کے ساتھ ''أضعافا مضاعفة'' کی قید لگی ہوئی ہے اور نہی قید پر داخل ہوئی ہے، لہٰذا صرف وہ ربا ممنوع ہوگا جس میں سود کی رقم

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں تحفة الفقهاء لعلاء الدين السمرقندی ۲/۲۵ باب الربوا۔ طبع دار الكتب العلمية۔ وبدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع للكاسانی ۵/۱۸۳ فصل فی شرائط الصحة فی البيوع۔ طبع دار الكتب العلمية۔ از مرتب عفا اللہ عنہ

(۲) سورة آل عمران آیت (۱۳۰)۔

رأس المال سے کم از کم دوگنی ہوجائے، لیکن یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ "أضعافا مضاعفة" کی قید باجماعِ امت احترازی نہیں، بلکہ اتفاقی ہے اور یہ قید بالکل ایسی ہے جیسے قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۱)

اس آیت میں اگرچہ "ثمن قلیل" کی قید لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی بھی عقل مند انسان اس آیت کا یہ مطلب نہیں لیتا کہ آیاتِ قرآنی کو "ثمن قلیل" کے ساتھ فروخت کرنا تو جائز نہیں، لیکن "ثمن کثیر" کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے اور اس قید کے اتفاقی ہونے کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① قرآنِ کریم کی آیت ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲)

اس آیت میں لفظ "ما" عام ہے جو ربا کی ہر قلیل اور کثیر مقدار کو شامل ہے۔

② خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمادیا کہ

"الربوا موضوع كله، وأول ربوا أضعه ربوا العباس بن عبد المطلب فإنه موضوع كله"(۳)

اس حدیث میں لفظ "كله" ہر مقدار ربا کی حرمت پر صریح ہے۔

---

(۱) سورة البقرة آیت (٤١)۔
(۲) سورة البقرة آیت (٢٧٨)۔
(۳) صحیح مسلم ٢/٨٨٦ (١٢١٨)۔

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"کل قرض جر نفعا فھو ربوا"(۱)

اس حدیث میں لفظ "نفعا" اس بات پر دال ہے کہ نفع کی ہر مقدار حرام ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت میں "أضعافا مضعفة" کی قید احترازی نہیں، بلکہ اتفاقی ہے۔

اعلانِ جنگ

حرمتِ ربا کی آیات قطعی الدلالت ہیں اور ربا کا معاملہ کرنے والوں کے بارے میں جو شدید وعید قرآنِ کریم میں آئی ہے ایسی شدید وعید شاید کسی دوسرے گناہ پر نہیں آئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِه (۲)

اس آیت میں صاف اعلان فرمادیا کہ اگر تم سودی لین دین نہیں چھوڑو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔

---

(۱) بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث ۱/۵۰۰ (۴۳۷) طبع مركز خدمة السنة والسيرة النبوية۔المدينة المنورة۔وأورده البوصيري في "الإتحاف" ۳/۳۸۰ (۲۹۳۷)، وقال: هذا إسناد ضعيف، لضعف سوار بن مصعب الهمداني۔طبع دار الوطن۔الرياض۔
(۲) سورة البقرة آیت (۲۷۸-۲۷۹)۔

کیا موجودہ بینکوں کا سود حرام نہیں؟

آج پوری دنیا سود کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی تو بنیاد ہی سود پر قائم ہے، سارے بینک سود کی بنیاد پر چل رہے ہیں، ساری تجارتیں سود کی بنیاد پر ہو رہی ہیں، بڑے بڑے سرمایہ دار اور بڑی بڑی کمپنیاں سودی بنیادوں پر بینک سے قرضہ لیتی ہیں اور اس سے اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔

چنانچہ عالمِ اسلام میں بعض عناصر ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ بینکوں کا سود وہ سود نہیں ہے جس کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا ہے اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اپنی ذاتی ضرورت کے لیے قرض لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس کھانے کے پیسے نہ ہوتے تو وہ بھوک کی حالت میں کسی صاحبِ استطاعت کے پاس جاتا اور اس کو جا کر کہتا کہ میں بھوکا ہوں، مجھے کچھ پیسے قرض دے دو تا کہ بیوی بچوں کو کھانا کھلا سکوں، جواب میں صاحبِ استطاعت کہتا ہے کہ میں سود پر قرض دوں گا، لہٰذا تم یہ وعدہ کرو کہ اس قرض کے ساتھ اتنا سود ادا کرو گے، ظاہر ہے کہ یہ ظلم کی بات تھی کہ ایک آدمی بھوکا ہے اور اس بھوک کو مٹانے کے لیے آپ سے قرض مانگ رہا ہے تو آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں، حالانکہ آپ کا اصل فرض تو یہ تھا کہ آپ اپنی طرف سے اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کرتے، نہ یہ کہ اس کو قرض دے کر الٹا اس سے سود کا مطالبہ کریں، ایسے سود کے بارے میں قرآنِ کریم نے فرمایا کہ اگر تم اس کو نہیں چھوڑو گے تو تمہارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

یا مثلاً ایک شخص کے گھر میں میت ہوگئی اور اس کے پاس کفن دفن کے لیے پیسے نہیں ہیں، وہ دوسرے شخص کے پاس جاتا ہے اور اس سے قرض مانگتا ہے تاکہ میت کے کفن دفن کا انتظام کر سکے اس موقع پر قرض دینے والا یہ مطالبہ کرے کہ میں اس وقت تک تمہیں قرض نہیں دوں گا جب تک تم اتنا سود ادا نہیں کروگے۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر سود کا مطالبہ کرنا انسانیت اور مروّت کے خلاف بات بنی، اس لیے اس قسم کے سود کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دیے دیا۔

تجارتی قرضوں پر سود

لیکن جہاں تک موجودہ دور کے بینکوں کے سود کا تعلق ہے اس میں قرض لینے والے غریب غرباء نہیں ہوتے جن کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا اور جن کے پاس میت کے کفن دفن کے انتظام کے لیے پیسے نہیں ہوتے، ایسے غریب غرباء کو تو بینک قرض دیتا ہی نہیں، اگر ہم اور آپ میں سے کوئی بینک سے قرض لینے جائیں گے تو بینک والے ہمیں مار کر باہر نکال دیں گے، بلکہ بینک سے قرض لینے والے بڑے بڑے سرمایہ دار اور دولت مند ہوتے ہیں، جو بھوک مٹانے اور کفن دفن کے لیے قرض نہیں لیتے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بینک سے قرض لے کر اس رقم کو اپنی تجارت میں لگا کر اس کو اور زیادہ ترقی دیں گے اور زیادہ نفع کمائیں گے، مثلاً ایک لاکھ روپیہ بینک سے قرض لے کر اس سے دو لاکھ بنائیں گے۔

دوسری طرف وہ روپیہ جو سرمایہ دار بینک سے بطور قرض لیتا ہے وہ عوام کا روپیہ ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی کمائی سے بچا بچا کر یہ روپیہ بینک میں بطور امانت

کے رکھوایا ہے، لہٰذا جو سرمایہ دار بینک سے قرض لے رہا ہے اگر اس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس قرض کے ذریعے تجارت کر کے جو نفع کماؤ گے اس نفع میں سے اتنا فی صد تم بینک کو بطور سود ادا کرو تو اس میں کون سا ظلم ہو جائے گا؟ اور اس زمانے میں جو سود رائج تھا اس میں قرض لینے والے پر ظلم ہوتا تھا، اس لیے قرآنِ کریم نے اس سود کو حرام قرار دے دیا، لہٰذا موجودہ دور کے بینکوں کا سود حرام نہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک قرض وہ ہے جس کو انسان اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے لیتا ہے، ایسے قرض کو ''صرفی قرض'' کہتے ہیں، دوسرا قرض وہ ہے جس کو انسان تجارت کرنے اور نفع کمانے کے لیے لیتا ہے ایسے قرض کو ''تجارتی قرض'' یا ''پیداواری قرض'' کہتے ہیں، سود کے جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ قرآنِ کریم نے ''صرفی قرض'' پر لیے جانے والے سود کو حرام کہا ہے، ''تجارتی قرض'' پر لیا جانے والا سود اس حرمت میں داخل نہیں۔

سود کے جواز پر استدلال

سود کے جواز کے قائلین قرآنِ کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ

أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (۱)

اس آیت میں لفظ ''الربوا'' معرف باللّام ہے اور الف لام میں اصل یہ ہے کہ وہ عہد کے لیے ہو، لہٰذا لفظ ''ربا'' سے وہ مخصوص ''ربا'' مراد ہوگا جو زمانہ

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۵)۔

جاہلیت میں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی دور میں رائج تھا، اس زمانے میں صرف ''صرفی قرض'' اور سود لینے کا رواج تھا، ''تجارتی قرض'' اور اس پر سود لینے کا اس وقت رواج نہیں تھا اور جو چیز اس زمانے میں رائج ہی نہیں تھی، قرآنِ کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے؟ لہٰذا حرمتِ سود کا اطلاق صرف ''صرفی قرض'' پر لیے جانے والے سود پر ہوگا، ''تجارتی قرض'' پر لیے جانے والے سود پر نہیں ہوگا۔

سود کے جواز کے قائلین

یہ وہ استدلال ہے جو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے کیا گیا اور جس کی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ بینکوں کا سود جائز ہے، یہاں تک کہ مصر کے موجودہ مفتیٔ اعظم نے بھی بینکوں کے سود کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے اور اس فتویٰ کی وجہ سے پورے عالمِ عرب میں ایک غلغلہ برپا ہے اور اس کا چرچا ہے، ان کے علاوہ عالمِ اسلام کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی اس موقف کا حامل کھڑا ہوتا رہا ہے، چنانچہ ہندوستان میں سر سید احمد خان، عرب میں مفتی عبدہ، رشید رضا بھی اس موقف کے حامل گزرے ہیں، پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کا موقف بھی یہی تھا اور جسٹس قدیر الدین نے اس کے جواز پر رسالہ بھی لکھا تھا، اگر آدمی غور سے نہ دیکھے تو بظاہر جواز کے قائلین کا استدلال دل کو اپیل کرتا ہے کہ اگر ایک سرمایہ دار بینک سے قرض لے کر نفع کما رہا ہے تو اس سے سود کا مطالبہ کرنا کون سے ظلم اور جرم کی بات ہے؟ چنانچہ نو تعلیم یافتہ طبقہ اس استدلال سے مرعوب ہو کر ان کا حامی ہو جاتا ہے۔

حکم حقیقت پر لگتا ہے صورت پر نہیں

حقیقت یہ ہے کہ جواز کے قائلین کا استدلال زبردست مغالطے پر مبنی ہے، ان کے استدلال کا صغری اور کبری دونوں غلط ہیں، ان کے استدلال کا صغری یہ ہے کہ عہدِ رسالت میں تجارتی سود رائج نہیں تھا اور کبری یہ ہے کہ جو چیز عہدِ رسالت میں رائج نہ ہو اس پر حرمت کا اطلاق نہیں ہوسکتا، صغری اور کبری دونوں غلط ہیں، لہٰذا ان کا استدلال درست نہیں۔

پہلے کبری کو سمجھ لیں کہ یہ کبری غلط ہے، دیکھیے اصول یہ ہے کہ قرآن یا حدیث جب کسی چیز پر حلت یا حرمت کا حکم لگاتے ہیں تو وہ حکم اس چیز کی کسی خاص شکل یا صورت پر نہیں لگاتے، بلکہ اس چیز کی حقیقت پر لگاتے ہیں، لہٰذا جہاں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں وہ حکم آجائے گا۔

مثلاً شراب کو لے لیں، جس زمانے میں شراب حرام ہوئی اس زمانے میں لوگ اپنے گھروں میں انگور کا شیرہ اپنے ہاتھوں سے نکال کر اس کو سڑا کر شراب بناتے تھے، لہٰذا اب موجودہ دور میں کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ اس زمانے میں لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں میں شراب بناتے تھے اور اس میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا اس لیے شراب حرام قرار دے دی گئی، اب چونکہ موجودہ دور میں شاندار مشینوں کے ذریعے حفظانِ صحت کے تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی صفائی ستھرائی کے ساتھ شراب بنائی جاتی ہے اس لیے شراب کی حرمت کا اطلاق موجودہ دور کی شراب پر نہیں ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ استدلال بالکل احمقانہ ہے، اس لیے کہ شریعت نے شراب کی کسی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اس کی حقیقت کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا جس شراب

کی وہ حقیقت پائی جائے گی اس پر حرمت کا اطلاق ہوجائے گا، چاہے اس کی وہ مخصوص صورت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو، لہٰذا آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہسکی، بیئر اور برانڈی موجود نہیں تھیں، اس لیے یہ حرام نہیں، ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ اس نام سے اور اس شکل میں موجود نہیں تھی، مگر اس کی حقیقت یعنی "ایسا مشروب جو نشہ آور ہو" موجود تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو حرام قرار دیا تھا، اب یہ حقیقت ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی، چاہے کسی زمانے میں بھی ہو اور کسی بھی نام سے پائی جائے۔

ایک لطیفہ/ گانا بجانا حرام نہ ہوتا

ہندوستان کا ایک گویا (گانے والا) ایک مرتبہ حج کرنے گیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جارہا تھا تو اس زمانے میں راستے میں قیام کے لیے منزلیں ہوتی تھیں، اس نے بھی رات گزارنے کے لیے ایک منزل پر قیام کیا، تھوڑی دیر کے بعد اسی منزل پر ایک عرب گویا آگیا اور عرب گویے نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کردیا۔ اس عرب گویے کی آواز بہت خراب اور بھدی تھی، ہندوستانی گویے کو اس کی آواز سے بہت کراہیت اور وحشت ہوئی، جب اس نے گانا بجانا بند کیا تو ہندوستانی گویے نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گانا بجانا کیوں حرام قرار دیا تھا، اس لیے کہ آپ نے اس جیسے بدوؤں کا گانا سنا تھا، اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو کبھی حرام قرار نہ دیتے۔

پھر تو خنزیر حلال ہونا چاہیے

آج کل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! چونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیز یا یہ عمل اس طرح ہوتا تھا، اس لیے آپ نے اس کو حرام قرار دیا تھا، لیکن آج کل چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہورہا، اس لیے یہ حرام نہیں، حتیٰ کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ شریعت نے خنزیر کو اس لیے حرام قرار دیا تھا کہ اس زمانے میں خنزیر گندے رہتے تھے، غلاظت کھاتے تھے، گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی، لیکن آج کل تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور ان کی پرورش کے لیے اعلیٰ درجے فارم قائم کردیے گئے ہیں، لہٰذا اب ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے حلال ہونے چاہئیں۔

بالکل اسی طرح سود کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ "تجارتی سود" حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کو حرام قرار نہ دیتے۔ اس کا جواب پہلے دیا جاچکا ہے کہ شریعت جس چیز کو حرام قرار دیتی ہے اس کی حقیقت کو حرام قرار دیتی ہے، اس کی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیتی، اسی طرح سود کی بھی حقیقت کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا جہاں کہیں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے اس "سود" کی مخصوص شکل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو۔

"سود کی حقیقت"

اب دیکھنا یہ ہے کہ "سود" کی حقیقت کیا ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا

ہے اور یہ حقیقت موجودہ دور کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ سود کی حقیقت یہ ہے کہ ''کسی شخص کو دیے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادتی کا مطالبہ کرنا''۔ مثلاً میں نے ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیے اور اس کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ ایک ماہ بعد تم سے ایک سو پانچ روپے واپس لوں گا، تو یہ سود ہے، البتہ اگر طے نہیں کیا، بلکہ میں اس کو ویسے ہی سو روپے قرض دے دیے، لیکن قرض لینے والے نے قرض واپس کرتے وقت اپنی خوشی سے ایک سو پانچ روپے واپس کیے تو یہ سود اور حرام نہیں۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے اور قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ اس کا قرض کچھ زیادتی کے ساتھ واپس کرتے تاکہ اس کی دلجوئی ہو، لیکن چونکہ یہ زیادتی پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ سود نہیں ہوتی تھی، حدیث کی اصطلاح میں اس کو ''حسن القضاء'' کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ

''إن خیارکم أحسنکم قضاء''[1]

یعنی تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ طے کر کے زیادہ ادا کرنا تو سود ہے اور طے کیے بغیر

(۱) صحیح البخاری ۹۹/۳ (۲۳۰۵)۔

زیادہ ادا کرنا سود نہیں، بلکہ ''حسنِ قضاء'' ہے، بہرحال چونکہ ''سود'' کی مندجہ بالا حقیقت موجودہ بینکوں کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے، اس لیے تجارتی سود بھی حرام ہوگا، مندرجہ بالا تفصیل سے تجارتی سود کے جواز کے قائلین کی دلیل کا کبریٰ غلط ثابت ہوگیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں تجارتی پھیلاؤ

ان کی دلیل کا صغریٰ یہ تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں تجارتی سود موجود نہیں تھا، یہ صغریٰ بھی غلط ہے، اس لیے کہ عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے اس میں بھی آج کے دور کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں، مثلاً آج کل مشترکہ کمپنیاں قائم ہوتی ہیں جن کو ''جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں'' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے، اس سے پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا، لیکن جب ہم عرب کی تاریخ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہوتا تھا، اس لیے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلے کے تمام افراد اپنا ایک ایک درہم اور ایک ایک دینار لا کر ایک جگہ جمع کردیتے، پھر اس رقم کو قافلے والے شام لے جا کر اس سے مالِ تجارت لا کر فروخت کرتے، چنانچہ آپ نے ''تجارتی قافلوں'' کا نام سنا ہوگا، وہ یہی کام کیا کرتے تھے، چنانچہ قرآنِ کریم میں یہ جو آیت ہے:

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝١ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاۗءِ وَالصَّيْفِ ۝٢ [1]

---

(۱) سورۃ قریش آیت (۱-۲)۔

اس آیت میں گرمیوں اور سردیوں کے جن سفروں کا ذکر ہے اس سے مراد یہی تجارتی قافلے ہیں، جو سردیوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے،[1] اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ یہاں مکہ مکرمہ سے سامان لے جا کر وہاں فروخت کرتے اور وہاں سے سامانِ تجارت لا کر مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیتے، ان قافلوں میں بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنی قبیلے سے دس دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا، ظاہر ہے کہ وہ یہ قرض کھانے پینے کی ضرورت کے لیے یا کفن دفن کے انتظام کے لیے نہیں لیتا تھا، بلکہ وہ تجارتی مقصد ہی کے لیے لیتا تھا۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جس تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے مکہ مکرمہ آرہے تھے جس پر مسلمانوں نے حملہ کا ارادہ کیا تھا جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگِ بدر پیش آئی، اس قافلے کے بارے میں محدثین اور اصحاب السیر نے لکھا ہے کہ

"لم یبق قرشی ولا قرشیة عنده درہم إلا وبعث به فی العیر"[2]

یعنی قریش مرد یا عورت کے پاس ایک درہم بھی تھا وہ اس نے اس تجارتی

(۱) ملاحظہ ہو تفسیر ابن ابی حاتم ۳٤٦٧/۱۰ (۱۹٤۹۱)۔

(۲) شرح الزرقانی علی المواہب ۲٦۳/۲ باب غزوة بدر العظمی۔طبع دارالکتب العلمیة۔وانارة الدجی فی مغازی خیر الوری ﷺ للشیخ المشاط المالکی ۱۰۸/۱ طبع دار المنہاج۔جدہ۔

قافلے میں بھیج دیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ قبیلے اس طرح مشترک سرمائے سے تجارت کرتے تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ بنو مغیرہ اور بنو ثقیف کے درمیان آپس میں قبائلی سطح پر سود کا لین دین ہوتا تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے سود پر قرض لیتا اور دوسرا قرض دیتا تھا، ایک قبیلہ سود کا مطالبہ کرتا اور دوسرا قبیلہ اس سود کو ادا کرتا تھا اور یہ سب تجارتی قرض ہوتے تھے۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضور اقدس ﷺ نے سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا:

"وربوا الجاهلية موضوع، وأول ربوا اضعه ربوا العباس بن عبد المطلب فإنه موضوع كله"(۱)

یعنی آج کے دن جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا۔

چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے اس لیے آپ نے فرمایا کہ میں آج کے دن ان کا وہ سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہے وہ ختم کرتا ہوں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ سود دس ہزار مثقال سونا تھا اور ایک مثقال تقریباً ۴ ماشے کا ہوتا ہے اور یہ دس ہزار مثقال سونا کوئی سرمایہ اور راس المال

---

(۱) صحیح مسلم ۸۸۶/۲ (۱۲۱۸)۔

نہیں تھا، بلکہ یہ وہ سود تھا جو اصل رقم پر واجب ہوا تھا، اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار مثقال سونے کا سود لگ گیا ہو کیا وہ صرف کھانے پینے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ تجارت کی غرض سے لیا گیا ہوگا۔

عہدِ صحابہ میں بینکاری کی ایک مثال

صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ ان کے پاس بطورِ امانت بڑی بڑی رقمیں رکھوانے کے لیے آتے تو وہ ان سے کہتے:

"لا ولکنہ سلف"[1]

یہ امانت نہیں، بلکہ قرض ہے، یعنی میں یہ رقم تم سے بطور قرض لیتا ہوں، یہ میرے ذمے قرض ہے، لیکن وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ قرض کی صورت میں طرفین کا فائدہ تھا، امانت رکھنے والوں کا تو یہ فائدہ تھا کہ اگر یہ رقم امانت کے طور پر رکھی ہوتی تو اس صورت میں حفاظت کے باوجود اگر ہلاک ہوجاتی یا چوری ہوجاتی تو اس کا ضمان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر نہ آتا، کیونکہ امانت کا ضمان نہیں ہوتا، اس کے برخلاف قرض کی رقم اگر ہلاک ہوجائے یا چوری ہو جائے تو اس کا ضمان قرض لینے والے پر آتا ہے، لہٰذا امانت رکھنے والوں کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کی رقم محفوظ اور مضمون ہوگئی اور دوسری طرف حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کو اس

(۱) صحیح البخاری ۴/۸۷ (۳۱۲۹)۔

بات کا اختیار حاصل ہوگیا کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہیں صرف کریں یا تجارت میں لگائیں، اس لیے کہ اگر وہ رقم امانت ہوتی تو امانتِ محضہ کو تجارت میں لگانا جائز نہیں۔

جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ان کے قرضوں کا حساب لگایا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"فحسبت ماعليه من الديون فوجدته ألفى ألف ومائتى ألف"(۱)

یعنی جب میں نے ان کے ذمے واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار (۲۲،۰۰،۰۰۰) نکلے، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا قرض "تجارتی قرض" ہی تھا، صرفی قرض نہیں تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تجارتی قرضوں کا رواج تھا۔

ایک اور مثال

تاریخِ طبری (۲) میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے حالات میں لکھا ہے کہ ہند بن عتبہ جو حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور بیت المال سے قرض دیے جانے کی اجازت طلب کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرض کی اجازت دے دی، انہوں نے اس قرض

(۱) الطبقات الكبرى لابن سعد ۱۰۸/۳ ذكر وصية الزبير وقضاء دينه۔طبع دار صادر بيروت۔

(۲) ملاحظہ ہو تاریخ طبری ۲۲۱/٤ طبع دار التراث العربی-بیروت۔

کی رقم سے ''بلاد کلب'' میں جا کر تجارت کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرض بھوک مٹانے کے لیے یا میت کی تدفین کے لیے نہیں لیا گیا تھا، بلکہ تجارت کے لیے لیا گیا تھا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں موجود ہیں جو میں نے ''تکملہ فتح الملہم'' میں تفصیل کے ساتھ لکھ دی ہیں، وہاں دیکھ لیا جائے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوا کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عہدِ رسالت میں تجارتی قرضے نہیں لیے جاتے تھے، بلکہ تجارتی قرضوں کا رواج تھا، البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''ربا'' کی حرمت کے اعلان کے بعد ان پر سود کا لین دین موقوف ہو گیا تھا، لہٰذا تجارتی سود کو جائز کہنے والوں نے جو دلیل پیش کی تھی اس کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ثابت ہو گئے۔

سود کو جائز کہنے والوں کا ایک اور استدلال

''سود'' کو جائز قرار دینے والوں کی طرف سے ایک استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذاتی ضروریات کے لیے یا کھانے پینے کی ضروریات کے لیے قرض مانگتا ہے اور قرض دینے والا شخص قرض دینے سے پہلے اس سے ''سود'' کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ ظلم اور ناانصافی کی بات ہے اور ایک غیر انسانی حرکت ہے، لیکن جو شخص تجارت کی غرض سے قرض مانگتا ہے تاکہ اس قرض کی رقم کو تجارت میں لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع کمائے، اگر اس سے ''سود'' کا مطالبہ کیا جائے تو اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں ہے، اس بات کی تائید میں قرآنِ کریم کی یہ آیت سے استدلال پیش کرتے ہیں:

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۱)

یعنی اگر تم ''سود'' سے توبہ کرلو تو پھر تمہارا جو رأس المال ہے، وہ تمہارا حق ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے، اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ''سود'' کی حرمت کی علت ''ظلم'' ہے اور یہ ظلم صرفی سود میں تو پایا جاتا ہے، لیکن تجارتی سود میں نہیں پایا جاتا، اس لیے ''تجارتی سود'' حرام نہ ہونا چاہیے۔

علت اور حکمت میں فرق

اس دلیل کے اندر چند در چند مغالطے ہیں، پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اس دلیل میں ''ظلم'' کو ربا کی حرمت کے لیے علت قرار دیا ہے، حالانکہ ظلم دور کرنا ربا کی حرمت کی علت نہیں ہے، بلکہ اس کی حکمت ہے اور حکم کا دارومدار ''علت'' پر ہوتا ہے حکمت پر نہیں ہوتا (۲)، اس کی سادہ سی مثال سمجھئے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں پر سگنل لگے ہوتے ہیں، اس میں تین رنگ کی بتیاں ہیں، سرخ، پیلی، سبز، جس وقت سرخ بتی جل رہی ہو اس وقت حکم یہ ہے کہ رک جاؤ اور جس وقت سبز بتی جلے اس وقت چل پڑو اور سگنل کا یہ نظام اس لیے قائم کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ٹریفک میں نظم وضبط قائم کیا جائے اور حادثات کی روک تھام کی جائے اور تصادم کا خطرہ کم سے کم کیا جائے، اس میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ''سرخ بتی پر رک جاؤ'' یہ حکم ہے اور ''سرخ بتی'' اس حکم کی علت ہے اور اس کے ذریعے حادثات کی روک تھام اس حکم کی ''حکمت'' ہے۔ اب ایک شخص رات

---

(۱) سورۃ البقرہ آیت (۲۷۹)۔

(۲) فتح القدیر لابن الهمام ۳۴۲/۴ طبع دار الفکر۔

کے بارہ بجے گاڑی چلاتا ہوا سگنل کے پاس پہنچا تو سرخ بتی جل رہی تھی، لیکن چاروں طرف سے کوئی گاڑی اور ٹریفک نہیں آرہا تھا اور تصادم اور حادثے کا کوئی خطرہ نہیں تھا، اس وقت اگرچہ اس حکم کی ''حکمت'' نہیں پائی جارہی تھی، لیکن پھر بھی ڈرائیور کے لیے گاڑی روکنا ضروری ہے، اس لیے کہ رکنے کے حکم کی جو علت ہے، یعنی ''سرخ بتی کا جلنا'' وہ پائی جارہی ہے، لہٰذا اگر وہ نہیں رکے گا تو قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں پکڑا جائے گا۔

شراب حرام ہونے کی حکمت

اسی طرح شریعت کے جتنے احکام ہیں اس میں حکم کا مدار ''علت'' پر ہوتا ہے، ''حکمت'' پر نہیں ہوتا، دنیا کے قوانین میں بھی یہی اصول کارفرما ہے اور شریعت کے قانون میں بھی یہی اصول جاری ہے، قرآنِ کریم نے شراب کے بارے میں فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۱)

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض کے بیج ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے، اب بتاؤ کہ کیا تم (ان چیزوں سے) باز آجاؤ گے؟

(۱) سورۃ المائدۃ آیت (۹۱)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کی حرمت کی ایک حکمت یہ بیان فرمائی کہ اس کے نتیجے میں آپس میں بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے اور انسان اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوجاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ شراب اور جوا اسی وقت حرام ہے جب اس کے نتیجے میں عداوت اور بغض پیدا ہو اور اگر عداوت اور بغض پیدا نہ ہو تو حرام نہیں، ظاہر ہے کہ یہ استدلال درست نہیں، اس لیے کہ عداوت اور بغض کا پیدا ہونا شراب اور جوئے کی حرمت کی ''حکمت'' ہے ''علت'' نہیں۔

ورنہ آج کل تو لوگ کہتے ہیں کہ شراب عداوت پیدا کرنے کے بجائے محبت اور دوستی پیدا کرتی ہے، چنانچہ آج کل جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو شراب کے جام ایک دوسرے کے جام سے ٹکراتے ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان دوستی قائم ہوگئی ہے، اسی بات کو بیان کرتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے کہ ؏

پیمانہ وفا برسرِ پیمانہ ہوا تھا

پہلے ''پیمانہ'' سے مراد ''عہد'' اور دوسرے پیمانہ سے مراد ہے ''جام شراب'' یعنی جام شراب پر عہد وفا ہوا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر شراب بغض اور عداوت پیدا کرنے کے بجائے دوستی کا ذریعہ بن رہی ہو تو اس صورت میں شراب حلال ہوجائے گی؟

یا کوئی شخص یہ کہے کہ میں شراب تو پیتا ہوں، لیکن اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا اس لیے میرے لیے شراب حلال ہے، تو کیا اس شخص کے لیے شراب حلال ہوجائے گی؟ ظاہر ہے کہ حلال نہیں ہوگی اس لیے کہ اللہ کے ذکر سے غفلت شراب کی حرمت کی ''حکمت'' ہے، ''علت'' نہیں ہے اور حکم کا دارو مدار ''علت''

پر ہوتا ہے، ''حکمت'' پر نہیں ہوتا۔

بالکل اسی طرح سود کی حرمت کے بارے میں قرآنِ کریم نے یہ جو فرمایا ہے کہ

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۱)

یہ بطور حکمت کے فرمایا ہے، بطور ''علت'' کے بیان نہیں فرمایا، لہٰذا ربا کے حرام ہونے کا دارومدار ظلم کے ہونے یا نہ ہونے پر نہیں، بلکہ ربا کی حقیقت کے پائے جانے پر ہے، جہاں ربا کی حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے وہاں ظلم پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ یہ تو پہلا مغالطہ تھا۔

شرعی احکام میں غریب اور امیر کا فرق نہیں

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ سود کو جائز کہنے والے کہتے ہیں کہ صرفی قرضوں میں اگر کوئی شخص سود کا مطالبہ کر رہا ہو تو چونکہ صرفی قرض طلب کرنے والا غریب ہوتا ہے اس لیے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے بخلاف تجارتی قرضوں کے، کیونکہ اس میں قرض طلب کرنے والا سرمایہ دار اور امیر ہوتا ہے اور اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم نہیں۔ یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ ایک جگہ سے سود لینا ظلم ہے اور دوسری جگہ سے لینا ظلم نہیں، حالانکہ اصل سوال یہ ہے کہ قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز نہیں تو پھر اس میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں کہ جیسے ایک نان بائی روٹی فروخت کر رہا ہے، ایک روٹی کی لاگت بارہ

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۹)۔

آنے آتی ہے اور چار آنے وہ اپنے نفع کے رکھ کر ایک روپے کی روٹی فروخت کر رہا ہے اور اس نے غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں رکھا کہ غریب کو کم قیمت پر روٹی دے اور امیر کو زیادہ قیمت پر روٹی دے، بلکہ سب کو ایک ہی قیمت پر دے رہا ہے، لیکن کوئی شخص بھی اس سے یہ نہیں کہتا کہ تم غریب کو ایک روپے کی روٹی فروخت کر کے ظلم کر رہے ہو، اس لیے کہ وہ اپنا حق وصول کر رہا ہے اور امیر اور غریب دونوں سے نفع کا مطالبہ کرنا درست ہے کوئی ظلم نہیں۔

بالکل اسی طرح ایک غریب شخص دوسرے سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسرا شخص اس قرض پر سود کا مطالبہ کرتا ہے تو آپ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرض لینے والا غریب ہے اس لیے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص غریب آدمی کو ایک روپے کی روٹی فروخت کر رہا ہے تو یہ ظلم نہیں اور دوسرا شخص اس غریب سے قرض پر سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ یہ ظلم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کی علت معاملہ کرنے والے کی غربت نہیں، بلکہ ظلم کی اصل علت روپیہ ہے اور یہ علت غریب کے قرض میں جس طرح پائی جارہی ہے امیر کے قرض میں بھی موجود ہے۔ حاصل یہ کہ روٹی پر نفع کا مطالبہ کرنا اور لاگت پر زیادتی کر کے فروخت کرنا ظلم نہیں، بلکہ جائز ہے اور انصاف کے مطابق ہے، لیکن روپے پر زیادتی کا مطالبہ کرنا انصاف کے بھی خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے کیونکہ روپیہ ایسی چیز نہیں کہ جس پر منافع کا مطالبہ کیا جائے، لہٰذا روپیہ قرض لینے والا امیر ہو یا غریب ہو دونوں صورتوں میں حرمت کا حکم عائد ہوگا۔

نفع اور نقصان دونوں میں شرکت کریں

تجارتی سود کو جائز کہنے والے ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ تجارتی سود میں ظلم نہیں، یہ بھی بالکل غلط بات ہے اس کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھیے شریعت نے یہ اصول بتایا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو کوئی قرض دے رہے ہو تو پہلے یہ فیصلہ کرلو کہ تم اس رقم کے ذریعے اس کی امداد کرنا چاہتے ہو یا اس کے کاروبار میں شریک ہونا چاہتے ہو؟ اگر قرض دینے سے تمہارا مقصد اس کی امداد کرنا ہے تو پھر وہ محض امداد ہی رہنی چاہیے، اس پر پھر تمہیں کسی زیادتی کے مطالبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں،اور اگر اس رقم کے ذریعے اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر اس صورت میں تمہیں اس کے کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا پڑے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ یہ کہہ دیں کہ منافع میں تو ہم حصہ دار بنیں گے اور نقصان میں حصہ دار نہیں بنیں گے۔

تجارتی سود میں قرض دینے والا بینک سرمایہ دار سے کہتا ہے کہ میں اس قرض پر تم سے پندرہ فی صد سود لوں گا، چاہے تمہیں اس تجارت میں نفع ہو یا نقصان ہو، مجھے تمہارے نفع ونقصان سے کوئی سروکار نہیں، مجھے تو اپنے سود سے مطلب ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات شریعت کے اصول کے خلاف ہے۔

قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہے

اس تجارتی سود کا ایسا گورکھ دھندا ہے کہ اس کی ہر صورت میں ظلم ہے، اگر سرمایہ دار تاجر کو نفع ہو تب بھی ظلم ہے اور اگر نقصان ہو تب بھی ظلم ہے، نفع کی صورت میں قرض دینے والے پر ظلم ہے اور نقصان کی صورت میں قرض لینے

والے پر ظلم ہے۔ آج کی دنیا میں بینکوں کے اندر جس طرح کا مالیاتی نظام جاری ہے اس میں قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہو رہا ہے۔

اس بات کو سمجھنے سے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ عام طور پر بینکوں کے اندر عوام کی رکھی ہوئی امانتیں ہوتی ہیں، گویا عوام کی رقم سے بینک وجود میں آتے ہیں، لیکن اگر یہی عوام بینک سے قرضہ لینے جائیں تو بینک ان کو قرضہ نہیں دے گا، بلکہ بینک ان سرمایہ داروں کو قرضہ دیتا ہے جن کے پاس پہلے سے سرمایہ موجود ہے، لیکن بینک سے قرض لے کر بہت بڑے پیمانے پر تجارت کرنا چاہتے ہیں یا وہ سرمایہ دار جن کی فیکٹریاں اور ملیں قائم ہیں وہ ان میں مزید اضافہ کرنے کے لیے بینک سے قرضہ لیتے ہیں۔

اب ہوتا یہ ہے کہ مثلاً ایک سرمایہ دار نے بینک سے ایک لاکھ روپیہ پندرہ فی صد سود کی بنیاد پر قرضہ لیا اور اس میں کچھ رقم اپنی طرف سے ملا کر کاروبار شروع کیا۔ بعض اوقات کاروبار میں سو فی صد نفع بھی ہوجاتا ہے اور بعض اوقات کم بھی ہوجاتا ہے، اب فرض کریں کہ اس سرمایہ دار کو اس کاروبار میں سو فی صد نفع ہوا، جس کے نتیجے میں ایک لاکھ کے دو لاکھ ہوگئے اور ایک لاکھ اصل سرمایہ اور ایک لاکھ نفع کے، اس نفع میں سے اس نے پندرہ ہزار روپے بینک کو بطور سود ادا کیے اور باقی ۸۵ ہزار روپے اپنی جیب میں رکھ لیے اور پھر بینک نے ان ۱۵ ہزار روپے میں سے اپنے اخراجات اور مصارف نکالنے کے بعد سات ہزار روپے ان عوام کو دیے جن کے پیسوں سے تاجر نے تجارت کرکے ایک لاکھ روپے کمائے تھے اور اس میں سے خود تاجر نے ۸۵ ہزار روپے رکھ لیے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اس عوام پر کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے، لیکن وہ عوام بہت خوش

ہے کہ اس کو ایک لاکھ روپے پر سات ہزار روپے نفع کے مل گئے، حالانکہ اس کے ایک لاکھ روپے پر ایک لاکھ روپے کا نفع ہوا تھا۔

اور پھر دوسری طرف عوام کو جو سات ہزار روپے ملے سرمایہ دار وہ سات ہزار روپے بھی دوسری طرف سے وصول کر لیتا ہے، وہ اس طرح کہ تاجروں کا اصول یہ ہے کہ تاجر جو سود بینک کو ادا کرتا ہے وہ اس سود کو اپنی تیار کردہ اشیاء کی لاگت اور مصارف میں شامل کردیتا ہے، مثلاً فرض کریں کہ اس تاجر نے اس ایک لاکھ روپے سے کپڑا تیار کیا، اس کپڑے کی قیمت مقرر کرنے سے پہلے وہ اس کپڑے کی تیاری پر آنے والی لاگت کا حساب لگائے گا اور اس لاگت میں اس پندرہ ہزار کو بھی شامل کرے گا جو اس نے بطور سود کے بینک کو ادا کیے تھے اور پھر اس پر نفع رکھ کر اس کپڑے کی قیمت مقرر کرے گا، اس طرح کپڑے کی قیمت میں خود بخود پندرہ فی صد اضافہ ہوجائے گا اور بازار میں جب عوام اس کپڑے کو خریدیں گے تو پندرہ فی صد سود کی رقم ادا کر کے کریں گے جو پندرہ فی صد تاجر نے بینک کو ادا کیے تھے، اس طرح سرمایہ دار ایک طرف تو عوام کو صرف ۷ فی صد منافع دے رہا ہے، لیکن دوسری طرف وہ ان عوام سے پندرہ فی صد وصول بھی کر رہا ہے، لیکن وہ عوام خوش ہیں کہ مجھے سات فی صد منافع مل گیا، حالانکہ حقیقت میں اس کو ایک لاکھ روپے کا ۹۳ ہزار روپے وصول ہوئے۔

یہ تفصیل تو اس صورت میں تھی جب تاجر کو نفع ہو اور اگر نقصان ہوجائے تو نقصان کی صورت میں وہ نقصان کی تلافی کے لیے مزید قرض بینک سے وصول کرتا ہے اور قرض کی رقم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ بینک دیوالیہ ہوجاتا ہے اور بینک کے دیوالیہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے

اس بینک میں رقمیں رکھوائی تھیں وہ اب واپس نہیں ملیں گی، جیسے گزشتہ چند سال پہلے ''بی سی آئی'' بینک میں ہوا۔ گویا کہ اس صورت میں نقصان سارا عوام کا ہوا اور تاجر کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ تجارتی سود کے نتیجے میں جو ظلم ہوتا ہے اس نے صرفی سود کے ظلم کو بھی مات کردیا ہے، اس لیے کہ تجارت میں پیسہ سارا عوام کا استعمال ہو رہا ہے، پھر اگر نفع ہو تو سرمایہ دار کا اور اگر نقصان ہو تو عوام کا، اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہ تو نقصان کی وہ صورت تھی جس میں بینک ہی دیوالیہ ہوجائے، لیکن اگر اس تجارت کے دوران سرمایہ دار کا جزوی نقصان ہوجائے۔ مثلاً اس نے کپڑا بنانے کے لیے روئی خریدی تھی، اس روئی میں آگ لگ گئی، تو اس نقصان کی تلافی کے لیے اس سرمایہ دار نے ایک دوسرا راستہ نکالا ہے، وہ ہے ''انشورنس کمپنی'' وہ انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی اور انشورنس کمپنی میں جو روپیہ ہے وہ بھی غریب عوام کا ہے، وہ عوام جو اپنی گاڑی اس وقت تک روڈ پر نہیں چلا سکتے جب تک انشورنس نہ کرالیں، عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ تو شاذ ونادر ہی ہوتا ہے، لیکن وہ ''بیمہ'' کی قسطیں ہر ماہ جمع کرنے پر مجبور ہیں، لہٰذا وہ سرمایہ دار انہیں عوام کے پیسوں سے اپنے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔

سود کا ادنیٰ شعبہ اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے

یہ سارا گورکھ دھندا اس لیے کیا جارہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار کا ہو اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو اور اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جارہی ہے، جو مالدار ہے وہ مالدار تر ہوتا جارہا ہے اور جو غریب ہے وہ غریب تر بنتا جارہا ہے، انہی خرابیوں کی وجہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا:

"إن الربوا بضع وسبعون شعبة أدناها كالذي يقع على أمه"[1]

یعنی ربا کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں اور اس کا ادنیٰ ترین شعبہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرنا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ تجارتی سود میں ظلم نہیں یہ بالکل غلط ہے، اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ اجتماعی طور پر پوری قوم کو معاشی بدحالی کے اندر مبتلا کیا جارہا ہے، آج پوری دنیا میں سودی نظام رائج ہے اور اس نظام نے پوری دنیا کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے اور ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کھل جائے گی اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآنِ کریم نے سود کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کیا تھا؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سود کی اس لعنت سے محفوظ رکھے آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

---
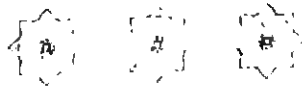
(۱) شعب الایمان للبیہقی ۳٦٤/۷ (۵۱۳۲-۵۱۳٤) والمنتقی لابن الجارود ص ۱٦۳ (٦٤۷) والمستدرک للحاکم ٤۳/۲ (۲۲۵۹) وقال: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه، ووافقه الذهبي في "التلخيص".
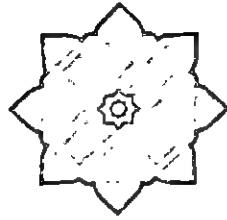
سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل

(اصلاحی خطبات ج ۷ ص ۱۴۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ [۱]

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۶)۔

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین

مغربی دنیا کے مسلمانوں کی مشکلات

میرے محترم بھائیو اور بہنو! آج کی نشست کے لیے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے وہ ''ربا'' سے متعلق ہے اور جس کو اردو میں سود اور انگریزی میں Usury یا Interest کہا جاتا ہے اور غالباً اس موضوع کو اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یوں تو ساری دنیا میں اس وقت سود کا نظام چلا ہوا ہے، لیکن بالخصوص مغربی دنیا میں جہاں آپ حضرات قیام پذیر ہیں وہاں بیشتر معاشی سرگرمیاں سود کی بنیاد پر چل رہی ہیں، اس لیے مسلمانوں کو قدم قدم پر مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کس طرح معاملات کریں اور سود سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں اور آج کل مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی لوگوں کے درمیان پھیلائی جارہی ہیں کہ آج کل معاشی زندگی میں جو Interest چل رہا ہے وہ وہ درحقیقت حرام نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اس ربا کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا جس کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا تھا۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے اس وقت یہ موضوع دیا گیا ہے کہ میں Interest کے موضوع پر جو بنیادی معلومات ہیں وہ قرآن وسنت اور موجودہ حالات کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

سودی معاملہ کرنے والوں کے لیے اعلانِ جنگ

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ سود کو قرآنِ کریم نے اتنا بڑا گناہ قرار

دیا ہے کہ شاید کسی اور گناہ کو اتنا بڑا گناہ قرار نہیں دیا، مثلاً شراب نوشی، خنزیر کھانا، زنا کاری، بدکاری وغیرہ کے لیے قرآنِ کریم میں وہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے جو سود کے لیے استعمال کیے گئے ہیں چنانچہ فرمایا کہ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (1)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو اگر تمہارے اندر ایمان ہے، اگر تم سود کو نہیں چھوڑو گے (یعنی سود کے معاملات کرتے رہو گے) تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔

یعنی ان کے لیے اللہ کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہے۔ یہ اعلانِ جنگ اللہ کی طرف سے کسی بھی گناہ پر نہیں کیا گیا، چنانچہ جو لوگ شراب پیتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہے یا جو خنزیر کھاتے ہیں ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور نہ یہ کہا گیا کہ جو زنا کرتے ہیں ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، لیکن سود کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ سود کے معاملات کو نہیں چھوڑتے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے، اتنی سخت اور سنگین وعید اس پر وارد ہوئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس پر اتنی سخت اور سنگین وعید کیوں ہے؟ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے معلوم ہوگی۔

(1) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۸-۲۷۹)۔

سود کس کو کہتے ہیں

لیکن اس سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ''سود'' کس کو کہتے ہیں، سود کیا چیز ہے، اس کی تعریف کیا ہے؟ جس وقت قرآنِ کریم نے سود کو حرام قرار دیا اس وقت اہلِ عرب میں سود کا لین دین متعارف اور مشہور تھا اور اس وقت سود اسے کہا جاتا تھا کہ کسی شخص کو دیے ہوئے قرض پر طے کرکے کسی بھی قسم کی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جائے، اسے سود کہا جاتا تھا، مثلاً میں آج ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیے اور میں اس سے کہوں کہ میں ایک مہینے بعد یہ رقم واپس لوں گا اور تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرنا اور یہ پہلے سے میں نے طے کردیا کہ ایک ماہ بعد ایک سو دو روپے واپس لوں گا، تو یہ سود ہے۔

معاہدہ کے بغیر زیادہ دینا سود نہیں

پہلے سے طے کرنے کی شرط اس لیے لگائی کہ اگر پہلے سے کچھ طے نہیں کیا ہے مثلاً میں نے کسی کو سو روپے قرض دے دیے اور میں نے اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرو گے، لیکن واپسی کے وقت اس نے اپنی خوشی سے مجھے ایک سو دو روپے دے دیے اور ہمارے درمیان یہ ایک سو دو روپے واپس کرنے کی بات طے شدہ نہیں تھی، تو یہ سود نہیں اور حرام نہیں ہے، بلکہ جائز ہے۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے

تو وہ قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ وہ قرض کچھ زیادتی کے ساتھ بڑھتا ہوا واپس فرماتے تاکہ اس کی دلجوئی ہوجائے، لیکن یہ زیادتی چونکہ پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ سود نہیں ہوتی تھی اور حدیث کی اصطلاح میں اس کو ''حسن القضاء'' کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا اور ادائیگی کے وقت اچھا معاملہ کرنا اور کچھ زیادہ دے دینا، یہ سود نہیں ہے، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ

''إن خيار كم أحسنكم قضاء''(۱)

یعنی تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں، لیکن اگر کوئی شخص قرض دیتے وقت یہ طے کرلے کہ میں جب واپس لوں گا تو زیادتی کے ساتھ لوں گا، اس کو سود کہتے ہیں اور قرآنِ کریم نے اسی کو سخت اور سنگین الفاظ کے ساتھ حرام قرار دیا اور سورۂ بقرہ کے تقریباً پورے دو رکوع اس ''سود'' کی حرمت پر نازل ہوئے ہیں۔

قرآنِ کریم نے کس ''سود'' کو حرام قرار دیا؟

بعض اوقات ہمارے معاشرے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس سود کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا تھا وہ درحقیقت یہ تھا کہ اس زمانے میں قرض لینے والا غریب ہوتا تھا اور اس کے پاس روٹی اور کھانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، اگر وہ بیمار ہے تو اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، اگر گھر میں کوئی میت ہے تو اس کے پاس اس کو کفنانے اور دفنانے کے پیسے نہیں ہوتے تھے،

(۱) صحیح البخاری ۹۹/۳ (۲۳۰۵)۔

ایسے موقع پر وہ غریب بے چارہ کسی سے پیسے مانگتا تو وہ قرض دینے والا اس سے کہتا کہ میں اس وقت تک قرض نہیں دوں گا جب تک تم مجھے اتنا فی صد زیادہ واپس نہیں کردوگے، تو چونکہ یہ انسانیت کے خلاف بات تھی کہ ایک شخص کو ایک ذاتی ضرورت ہے اور وہ بھوکا ننگا ہے ایسی حالت میں اس کو سود کے بغیر پیسے فراہم نہ کرنا ظلم اور زیادتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا اور سود لینے والے کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔

لیکن ہمارے دور میں اور خاص کر بینکوں میں جو سود کے ساتھ روپے کا لین دین ہوتا ہے اس میں قرض لینے والا کوئی غریب اور فقیر نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات وہ بڑا دولت مند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور وہ قرض اس لیے نہیں لیتا کہ اس کے پاس کھانے کو نہیں ہے یا اس کے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہے یا وہ کسی بیماری کے علاج کے لیے قرض لے رہا ہے، بلکہ وہ اس لیے قرض لے رہا ہے تاکہ وہ ان پیسوں کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگائے اور اس سے نفع کمائے اب اگر قرض دینے والا شخص یہ کہے کہ تم میرے پیسے اپنے کاروبار میں لگاؤ گے اور نفع کماؤ گے تو اس نفع کا دس فی صد بطور نفع کے مجھے دو تو اس میں کیا قباحت اور برائی ہے؟ اور یہ وہ سود نہیں ہے جس کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا ہے، یہ اعتراض دنیا کے مختلف خطوں میں اٹھایا جاتا ہے۔

تجارتی قرضے (Commercial Loan) ابتدائی زمانے میں بھی تھے

ایک اعتراض یہ اٹھایا ہے کہ یہ کاروباری سود (Commercial Interest) اور یہ تجارتی قرض (Commercial Loan) حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے زمانے میں نہیں تھے، بلکہ اس زمانے میں ذاتی خرچ اور ذاتی استعمال کے لیے قرضے لیے جاتے تھے لہٰذا قرآنِ کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جس کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا، اس لیے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے جس سود کو حرام قرار دیا وہ غریبوں اور فقیروں والا سود تھا اور یہ کاروباری سود حرام نہیں ہے۔

صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی

پہلی بات تو یہ ہے کسی چیز کے حرام ہونے کے لیے یہ بات ضروری نہیں کہ وہ اس خاص صورت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پائی جائے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس انداز سے اس کا وجود بھی ہو، قرآنِ کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت اس کے سامنے ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ حرام قرار دیتا ہے، چاہے اس کی کوئی خاص صورت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ قرآنِ کریم نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اور شراب کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا مشروب جس میں نشہ ہو، اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آج کل کی یہ وہسکی (Whisky) بیئر (Beer) اور برانڈی (Brandy) حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو نہیں پائی جاتی تھی لہٰذا یہ حرام نہیں ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ یہ اس خاص شکل میں موجود نہیں تھی، لیکن اس کی حقیقت یعنی ''ایسا مشروب جو نشہ آور ہو'' موجود تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دے دیا تھا، لہٰذا اب وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی، اب چاہے شراب کی نئی شکل سامنے آجائے اور اس کا نام چاہے

وہسکی (Whisky) رکھ دیا جائے یا برانڈی رکھ لو یا بیئر رکھ لو یا کوک (Coke) رکھ لو، نشہ آور مشروب ہر شکل اور ہر نام کے ساتھ حرام ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ''کمرشل لون'' چونکہ اس زمانے میں نہیں تھے، بلکہ آج پیدا ہوئے ہیں اس لیے حرام نہیں ہیں یہ خیال درست نہیں۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ یاد آیا ہندوستان کے اندر ایک گویا (گانے والا) تھا، وہ ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا، حج کے بعد وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جا رہا تھا کہ راستے میں ایک منزل پر اس نے قیام کیا، اس زمانے میں مختلف منزلیں ہوتی تھیں، لوگ ان منزلوں پر رات گزارتے اور اگلے دن صبح آگے کا سفر کرتے، اس لیے گویے نے راستے میں ایک منزل پر رات گزارنے کے لیے قیام کیا اور اس منزل پر ایک عرب گویا بھی آ گیا اور اس نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کر دیا، عرب گویے کی آواز ذرا بھدی اور خراب تھی، کریہہ الصوت تھا، اب ہندوستانی گویے کو اس کی آواز بہت بری لگی اور اس نے اٹھ کر کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گانا بجانا کیوں حرام قرار دیا تھا اس لیے کہ آپ نے ان بدوؤں کا گانا سنا تھا اس لیے حرام قرار دے دیا، اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو آپ گانا بجانا حرام قرار نہ دیتے۔

آج کل کا مزاج

آج کل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ

صاحب! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ عمل اس طرح ہوتا تھا اس لیے آپ نے اس کو حرام قرار دے دیا، آج چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہو رہا ہے لہٰذا وہ حرام نہیں ہے، کہنے والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ خنزیروں کو اس لیے حرام قرار دیا گیا تھا کہ وہ گندے ماحول میں پڑے رہتے تھے غلاظت کھاتے تھے گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی اب تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور ان کے لیے اعلیٰ درجے کے فارم قائم کر دیے گئے ہیں، لہٰذا اب ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

شریعت کا ایک اصول

یاد رکھیے! قرآنِ کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے اس کی صورتیں چاہے کتنی بدل جائیں اور اس کو بنانے اور تیار کرنے کے طریقے چاہے کتنے بدلتے رہیں، لیکن اس کی حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور وہ حقیقت حرام ہوتی ہے، یہ شریعت کا اصول ہے۔

زمانہ نبوت کے بارے میں ایک غلط فہمی

پھر یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں تجارتی قرضوں (Commercial Loan) کا رواج نہیں تھا اور سارے قرضے صرف ذاتی ضرورت کے لیے لیے جاتے تھے، اس موضوع پر میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے ''مسئلہ سود'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس کا دوسرا حصہ میں نے لکھا ہے۔ اس حصے میں، میں نے کچھ مثالیں پیش کی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تجارتی

قرضوں کا لین دین ہوتا تھا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ عرب صحرا نشین تھے تو اس کے ساتھ ہی لوگوں کے ذہن میں یہ تصوّر آتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس ﷺ تشریف لائے تھے وہ ایسا سادہ اور معمولی معاشرہ ہوگا جس میں تجارت وغیرہ تو ہوتی نہیں ہوگی اور اگر تجارت ہوتی بھی ہوگی تو صرف گندم اور جو وغیرہ کی ہوتی ہوگی اور وہ بھی دس بیس روپے سے زیادہ کی نہیں ہوگی، اس کے علاوہ کوئی بڑی تجارت نہیں ہوگی، عام طور پر ذہن میں یہ تصوّر بیٹھا ہوا ہے۔

ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی ہوتا تھا

لیکن یاد رکھیے! یہ بات درست نہیں، عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس ﷺ تشریف لائے اس میں بھی آج کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں، مثلاً آج کل ''جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں'' ہیں، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے، اس سے پہلے ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' کا تصوّر نہیں تھا، لیکن جب ہم عرب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ مستقل ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہوتا تھا، اس لیے کہ ہر قبیلے کی تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلے کے تمام آدمی ایک روپیہ دو روپیہ لا کر ایک جگہ جمع کرتے اور وہ رقم شام بھیج کر وہاں سے سامانِ تجارت منگواتے، آپ نے تجارتی قافلوں (Commercial Caravan) کا نام سنا ہوگا، وہ کارواں یہی ہوتے تھے کہ سارے قبیلے نے ایک ایک روپیہ جمع کر کے دوسری جگہ بھیجا اور وہاں سے سامانِ تجارت منگوا کر یہاں فروخت کر دیا، چنانچہ قرآنِ کریم میں یہ جو فرمایا ہے کہ

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝ (۱)

وہ بھی اسی بناء پر کہ یہ عرب کے لوگ سردیوں میں یمن کی طرف سفر کیا کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے اور گرمیوں اور سردیوں کے یہ سفر محض تجارت کے لیے ہوتے تھے (۲)، یہاں سے سامان لے جا کر وہاں بیچ دیا وہاں سے سامان لا کر یہاں بیچ دیا اور بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا، اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لیے قرض لیتا تھا کہ اس کے گھر میں کھانے کو نہیں تھا؟ یا اس کے پاس میت کو کفن دینے کے لیے کپڑا نہیں تھا؟ ظاہر ہے کہ جب وہ اتنا بڑا قرض لیتا تھا تو وہ کسی کمرشل مقصد کے لیے لیتا تھا۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"وربا الجاهلية موضوع وأول ربا ما أضعه ربانا ربا عباس بن عبد المطلب فإنه موضوع كله" (۳)

یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم

---

(۱) سورۃ قریش آیت (۱-۲)۔
(۲) تفسیر ابن ابی حاتم ۱۰/۳٤٦۷ (۱۹٤۹۱)۔
(۳) صحیح مسلم ۲/۸۸٦ (۱۲۱۸)۔

کر دیا گیا، چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے اس لیے آپ نے فرمایا کہ آج کے دن میں ان کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہے وہ ختم کرتا ہوں اور روایات میں آتا ہے کہ وہ دس ہزار مثقال سونا تھا اور تقریباً ۴ ماشے کا ایک مثقال ہوتا ہے اور یہ دس ہزار مثقال کوئی سرمایہ (Principal) نہیں تھا، بلکہ یہ وہ سود تھا جو لوگوں کے ذمے اصل رقوم پر واجب تھا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار کا سود لگ گیا ہو کیا وہ قرض صرف کھانے کی ضرورت کے لیے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کے لیے لیا گیا ہوگا۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینکاری کی ایک مثال

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں انہوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آجکل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لا کر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقم بطور قرض لیتا ہوں، یہ رقم میرے ذمے قرض ہے اور پھر آپ اس رقم کو تجارت میں لگاتے، چنانچہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

"فحسبت ما عليه من الديون فوجدته ألفي ألف ومائتي ألف"(۱)

یعنی میں نے ان کے ذمہ واجب الاداء قرضوں کا حساب

(۱) الطبقات الکبری لابن سعد ۱۰۸/۳ ذکر وصية الزبير وقضاء دينه وجميع تركته۔

لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تجارتی قرض نہیں ہوتے تھے یہ بالکل خلافِ واقعہ بات ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ تجارتی قرض بھی ہوتے تھے اور اس پر سود کا لین دین بھی ہوتا تھا اور قرآنِ کریم نے ہر قرض پر جو بھی زیادتی وصول کی جائے اس کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ کمرشل لون پر انٹرسٹ لینا جائز ہے اور ذاتی قرضوں پر انٹرسٹ لینا جائز نہیں یہ بالکل غلط ہے۔

سود مرکب اور سود مفرد دونوں حرام ہیں

اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی پھیلائی جارہی ہے وہ یہ کہ ایک سودِ مفرد (Simple Interest) ہوتا ہے اور ایک سودِ مرکب (Compound Interest) ہوتا ہے، یعنی سود پر بھی سود لگتا چلا جائے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں مرکب سود ہوتا تھا اور قرآنِ کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے، لیکن سودِ مفرد جائز ہے اس لیے کہ اس زمانے میں نہیں تھا اور نہ ہی قرآن نے اس کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ابھی قرآن کی جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اس میں فرمایا کہ

يَآاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا(۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ربا کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو۔

یعنی اس کے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں یا Rate of Interest

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۸)۔

کے کم یا زیادہ ہونے کی بحث نہیں، جو کچھ بھی ہو اس کو چھوڑ دو اور اس کے بعد آگے فرمایا کہ

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ (۱)

یعنی اگر تم ربا سے توبہ کرلو تو پھر تمہارا جو رأس المال(Principal) ہے وہ تمہارا حق ہے اور خود قرآنِ کریم نے واضح طور پر فرمادیا کہ Principal تو تمہارا حق ہے، لیکن اس کے علاوہ تھوڑی سی زیادتی بھی ناجائز ہے، لٰہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود مرکب حرام ہے اور سودِ مفرد حرام نہیں، بلکہ سود کم ہو یا زیادہ سب حرام ہے اور قرض لینے والا غریب ہو تب بھی حرام ہے اور قرض لینے والا امیر اور مالدار ہو تو بھی حرام ہے اور اگر تجارت کے لیے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

موجودہ بینکنگ انٹرسٹ بالاتفاق حرام ہے

یہاں یہ بات بھی عرض کردوں کہ تقریباً ۵۰، ۶۰ سال تک عالمِ اسلام میں بینکنگ انٹرسٹ(Banking Interest) کے بارے میں سوالات اٹھائے جاتے رہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ Compound Interest حرام ہے،Simple Interest حرام نہیں ہے یا یہ کہنا کہ Commercial Loan حرام نہیں ہے وغیرہ، یہ اشکالات اور اعتراضات عالمِ اسلام میں تقریباً ۵۰ سال تک ہوتے رہے ہیں، لیکن اب یہ بحث ختم ہوگئی ہے، اب ساری دنیا کے نہ صرف علماء، بلکہ ماہرینِ معاشیات اور

(۱) سورۃ البقرۃ آیت(۲۷۹)۔

مسلم بینکرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح عام قرض کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے اور اب اس پر اجماع ہو چکا ہے، کسی قابلِ ذکر شخص کا اس میں اختلاف نہیں، اس کے بارے میں آخری فیصلہ آج سے تقریباً ۴ سال پہلے جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی (Islamic Fiqh Acadmy) جس میں ۴۵ مسلم ملکوں کے سرکردہ علماء کا اجتماع ہوا اور جس میں میں بھی شامل تھا اور ان تمام ملکوں کے تقریباً ۲۰۰ علماء نے بالاتفاق یہ فتوی دیا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے اور اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا یہ مسئلہ تو اب ختم ہو چکا ہے کہ حرام ہے یا نہیں؟

کمرشل لون پر انٹرسٹ میں کیا خرابی ہے؟

اب ایک بات باقی رہ گئی ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے، وہ یہ کہ شروع میں جیسا کہ عرض کیا تھا کہ لوگ کہتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں صرف ذاتی ضرورت کے لیے قرض لیے جاتے تھے، اب اگر ایک شخص ذاتی ضرورت کے لیے قرض لے رہا ہے۔ مثلاً اس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے یا میت کو دفنانے کے لیے کفن نہیں ہے اس کے لیے وہ قرض لے رہا ہے اور آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یہ ایک غیر انسانی حرکت اور ناانصافی کی بات ہے، لیکن جو شخص میرے پیسے کو تجارت میں لگا کر نفع کمائے گا، اگر میں نفع میں اس سے تھوڑا حصہ لے لوں تو اس میں کیا خرابی ہے؟

آپ کو نقصان کا خطرہ (Risk) بھی برداشت کرنا ہوگا

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اللہ کے کسی حکم میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، اگر کسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا وہ حرام ہوگئی، لیکن زیادہ اطمینان کے لیے یہ بات عرض کرتا ہوں تا کہ یہ بات اچھی طرح دل میں اتر جائے، وہ یہ کہ اگر آپ کسی شخص کو قرض دے رہے ہیں تو اس کے بارے میں اسلام یہ کہتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات متعین کرلو، کیا تم اس کی کچھ امداد کرنا چاہتے ہو؟ یا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو؟ اگر قرض کے ذریعے اس کی امداد کرنا چاہتے ہوتو وہ پھر آپ کی طرف سے صرف امداد ہی ہوگی، پھر آپ کو اس قرض پر زیادتی کے مطالبے کا کوئی حق نہیں اور اگر اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہوتو پھر جس طرح نفع میں حصہ دار بنو گے اسی طرح نقصان میں بھی اس کے حصہ دار بننا ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ تم صرف نفع میں حصہ دار بن جاؤ، نفع ہوتو تمہارا اور اگر نقصان ہوتو وہ اس کا، لہٰذا جس صورت میں آپ اس کو کاروبار کے لیے پیسے دے رہے ہیں تو پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ کاروبار میں نقصان کا خطرہ (Risk) تو وہ برداشت کرے اور نفع آپ کو مل جائے، بلکہ اس صورت میں آپ اس کو قرض نہ دیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک جوائنٹ انٹر پرائز (Joint Interprise) کیجیے اور اس کے ساتھ مشارکہ اور پارٹنرشپ (Partnership) کیجیے، یعنی اس سے معاہدہ کریں کہ جس کاروبار کے لیے تم قرض لے رہے ہو اس میں اتنا فی صد نفع میرا ہوگا اور اتنا تمہارا ہوگا، اگر اس کاروبار میں نقصان ہوگا تو وہ نقصان بھی اسی نفع کے تناسب سے ہوگا، لیکن یہ بالکل درست نہیں ہے کہ آپ تو اس سے یہ کہیں کہ اس قرض پر ۱۵ فی صد نفع آپ سے

لوں گا، چاہے تمہیں کاروبار میں نفع ہو یا نقصان ہو، یہ بالکل حرام ہے اور سود ہے۔

آج کل کے انٹرسٹ کے نظام کی خرابی

آج کل انٹرسٹ (Interest) کا جو نظام رائج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات قرض لینے والے کو نقصان ہوگیا، تو اس صورت میں قرض دینے والا فائدہ میں رہا اور قرض لینے والا نقصان میں رہا اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والے نے زیادہ شرح سے نفع کمایا اور قرض دینے والے کو اس نے معمولی شرح سے نفع دیا، اب قرض دینے والا نقصان میں رہا، اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھیے۔

ڈیپازیٹر ہر حال میں نقصان میں ہے

مثلاً ایک شخص ایک کروڑ روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت شروع کرتا ہے، اب وہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے اس کے پاس آیا؟ وہ ایک کروڑ روپیہ کس کا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ روپیہ اس نے بینک سے لیا اور بینک کے پاس وہ روپیہ ڈیپازیٹرز کا ہے، گویا کہ وہ ایک کروڑ روپیہ پوری قوم کا ہے اور اب اس نے قوم کے اس ایک کروڑ روپے سے تجارت شروع کی اور اس تجارت کے اندر اس کو سو فی صد نفع ہوا اور اب کے پاس دو کروڑ ہوگئے، جس میں سے ۱۵ فی صد یعنی ۱۵ لاکھ روپے اس نے بینک کو دیے اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا کمیشن اور اپنے اخراجات نکال کر باقی ۷ فی صد یا دس فی صد کھاتہ دار (Depositors) کو دے دیے، نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کا پیسہ تجارت میں لگا تھا جس سے اتنا نفع

ہوا ان کو تو سو روپے پر صرف دس روپے نفع ملا اور یہ بے چارہ ڈیپازیٹر بڑا خوش ہے کہ میرے سو روپے اب ایک سو دس ہو گئے، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ حقیقت میں اس کے پیسوں سے جو نفع کمایا گیا اس کے لحاظ سے ایک سو کے دو سو ہونے چاہیے تھے اور پھر دوسری طرف یہ دس روپے جو نفع اس کو ملا قرض لینے والا اس کو دوبارہ اس سے واپس وصول کر لیتا ہے، وہ کس طرح واپس وصول کرتا ہے؟

سود کی رقم مصارف میں شامل ہوتی ہے

وہ اس طرح وصول کرتا ہے کہ قرض لینے والا ان دس روپوں کو پیدا واری اخراجات اور مصارف (Cost of Production) میں شامل کر لیتا ہے مثلاً فرض کرو کہ اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر کوئی فیکٹری لگائی یا کوئی چیز تیار کی تو تیاری کے مصارف (Cost) میں ۱۵ فی صد بھی شامل کر دیے جو اس نے بینک کو ادا کیے، لہٰذا جب وہ پندرہ فی صد بھی شامل ہو گئے تو اب جو چیز بھی تیار (Produce) ہوگی اس کی قیمت پندرہ فی صد بڑھ جائے گی، مثلاً اس نے کپڑا تیار کیا تھا تو اب انٹرسٹ کی وجہ سے اس کپڑے کی قیمت پندرہ فی صد بڑھ گئی، لہٰذا ڈیپازیٹر جس کو ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے جب بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فی صد زیادہ دینی ہوگی، تو نتیجہ یہ نکلا کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فی صد نفع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ کر کے پندرہ فی صد وصول کر لیا گیا، یہ تو خوب نفع کا سودا ہوا۔ وہ ڈیپازیٹر خوش ہے کہ مجھے ایک سو روپے کے ایک سو دس روپے مل گئے، لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اس کو سو روپے کے بدلے ۹۵ روپے ملے، اس

لیے کہ وہ پندرہ فی صد کپڑے کی لاگت(Cost) میں چلے گئے اور دوسری طرف ۸۵ فی صد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلے گئے۔

شرکت کا فائدہ

اور اگر شرکت پر معاملہ ہوتا اور یہ طے پاتا کہ مثلاً ۵۰ فی صد نفع سرمایہ لگانے والے(Financier) کا ہوگا اور ۵۰ فی صد نفع تاجر کا ہوگا، تو اس صورت میں عوام کو ۱۵ فی صد کے بجائے ۵۰ فی صد نفع ملتا اور اس صورت میں یہ ۵۰ فی صد اس چیز کی لاگت(Cost) میں بھی شامل نہ ہوتا اس لیے کہ نفع تو اس پیداوار کی فروخت کے بعد سامنے آئے گا اور پھر اس کو تقسیم کیا جائے گا، اس لیے کہ سود(Interest) تو لاگت(Cost) میں شامل کیا جاتا ہے، لیکن نفع(Profit) لاگت(Cost) میں شامل نہیں کیا جاتا، تو یہ صورت اجتماعی نفع کی تھی۔

نفع کسی اور کا اور نقصان کسی اور کا

اور اگر فرض کرو کہ ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر جو تجارت کی اس تجارت میں اس کو نقصان ہوگیا وہ بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہوگیا، اب اس بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے میں کس کا روپیہ گیا؟ ظاہر ہے کہ عوام کا گیا، تو اس نظام میں نقصان ہونے کی صورت میں سارا نقصان عوام پر ہے اور اگر نفع ہے تو سارا کا سارا قرض لینے والے کا۔

بیمہ کمپنی سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے

قرض لینے والے تاجر کا اگر نقصان ہوجائے تو اس نے اس نقصان کی تلافی کے لیے ایک اور راستہ تلاش کرلیا ہے وہ ہے انشورنس(Insurance)، مثلاً فرض کرو کہ روئی کے گودام میں آگ لگ گئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کا فریضہ انشورنس کمپنی پر عائد ہوتا ہے اور انشورنس کمپنی میں کس کا پیسہ ہے؟ وہ غریب عوام کا پیسہ ہے، اس عوام کا پیسہ ہے جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لاسکتے جب تک اس کو انشورڈ (Insured) نہ کرالیں اور عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا، اس کو آگ نہیں لگتی، لیکن وہ بیمہ کی قسطیں (Premium) ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

ان غریب عوام کے بیمہ کی قسطوں سے انشورنس کمپنی کی عمارت تعمیر کی گئی اور غریب عوام کے ڈیپازیٹ کے ذریعے تاجر کے نقصان کی تلافی کرتے ہیں، لہٰذا یہ سارا گورکھ دھندا اس لیے کیا جارہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار تاجر کا ہو اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اس کے نتیجے میں یہ صورت حال ہورہی ہے، بینک میں جو پوری قوم کا روپیہ ہے اگر اس کو صحیح طریقے پر استعمال کیا جاتا تو اس کے تمام منافع بھی عوام کو حاصل ہوتے اور اب موجود نظام میں تقسیم دولت (Distribution of Wealth) کا جو سسٹم ہے اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جارہی ہے، انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود کھانا ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کاری کرنا۔ اتنا سنگین گناہ اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے پوری قوم کو تباہی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

سود کی عالمی تباہ کاری

آج سے پہلے ہم سود کو اس لیے حرام مانتے تھے کہ قرآنِ کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے، ہمیں اس کے عقلی دلائل سے زیادہ بحث نہیں تھی، اللہ تعالیٰ جب حرام قرار دے دیا ہے بس حرام ہے، لیکن آج اس کے نتائج آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، آج پوری دنیا میں انٹرسٹ کا نظام جاری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے اس ملک (امریکہ) کا دنیا میں طوطی بول رہا ہے اور اب تو اس کا دوسرا حریف بھی دنیا سے رخصت ہوگیا اور اب کوئی اس سے ٹکر لینے والا موجود نہیں، لیکن پھر بھی اقتصادی ابتری کا شکار ہے، اس کی بنیاد بھی انٹرسٹ ہے، اس لیے یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غریب فقیر قسم کے لوگ سود پر قرض لیا کرتے تھے اس سے سود کا مطالبہ کرنا حرام تھا، لیکن آج اگر کوئی شخص کمرشل لون پر سود لے رہا ہے تو اس کو حرام نہیں ہونا چاہیے، عقلی اور معاشی اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے، اگر کوئی غیر جانبداری سے اس نظام کا مطالعہ کرے تو اس کو پتہ چل جائے گا کہ اس نظام نے دنیا کو تباہی کے آخری کنارے تک پہنچادیا ہے، اور ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے حقیقت کھل جائے گی اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآنِ کریم نے سود کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کیا تھا؟ یہ تو سود کی حرمت کا ایک پہلو تھا جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا۔

سودی طریقہ کار کا متبادل

ایک دوسرا سوال بھی بہت اہم ہے جو آج کل لوگوں کے دلوں میں پیدا

ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ انٹرسٹ حرام ہے، لیکن اگر انٹرسٹ کو ختم کردیا جائے تو پھر اس کا متبادل طریقہ کیا ہوگا، جس کے ذریعے معیشت کو چلایا جائے؟ اس واسطے کہ آج پوری دنیا میں معیشت کی روح انٹرسٹ پر قائم ہے اور اگر اس کی روح کو نکال دیا جائے تو اس کو چلانے کا دوسرا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا، اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ انٹرسٹ کے سوا دوسرا کوئی نظام موجود ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو ممکن اور قابلِ عمل (Practicable) نہیں ہے اور اگر کسی کے پاس کوئی قابلِ عمل طریقہ ہے تو وہ بتائے کہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے اور ایک مجلس میں اس موضوع کا پورا حق ادا ہونا ممکن بھی نہیں ہے اور اس کا جواب تھوڑا سا ٹیکنیکل (Technical) بھی ہے اور اس کو عام فہم اور عام الفاظ میں بیان کرنا آسان بھی نہیں ہے، لیکن میں اس کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے۔

ناگزیر چیزوں کو شریعت میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا کہ یہ چیز حرام ہے تو پھر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ چیز ناگزیر ہو، اس لیے کہ اگر وہ چیز ناگزیر ہوتی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو حرام قرار نہ دیتے، اس لیے کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا(۱)

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۸۶)۔

یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیتے جو اس کی وسعت سے باہر ہو، لہٰذا ایک مومن کے لیے تو اتنی بات بھی کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام قرار دے دیا تو چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے کہ کون سی چیز انسان کے لیے ضروری ہے، لہٰذا جب اس چیز کو حرام قرار دے دیا تو یقیناً وہ چیز ضروری اور ناگزیر نہیں ہے، اس چیز میں کہیں خرابی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ ضروری اور ناگزیر معلوم ہورہی ہے، تو اب اس خرابی کو دور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا اور یہ چیز ناگزیر ہے۔

سودی قرضوں کا متبادل قرض حسنہ نہیں ہے

دوسری بات یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انٹرسٹ (Interest) جس کو قرآنِ کریم حرام قرار دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ جب کسی کو قرض دیا جائے تو ان کو غیر سودی قرض (Interest Free Loan) دینا چاہیے اور اس پر کسی منافع کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب انٹرسٹ ختم ہوجائے گا تو ہمیں پھر غیر سودی قرض ملا کریں گے، پھر جتنا قرض چاہیں حاصل کریں اور اس سے کوٹھیاں بنگلے بنائیں اور اس سے فیکٹریاں قائم کریں اور ہم سے کسی انٹرسٹ کا مطالبہ نہیں ہوگا اور اسی سوچ کی بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ صورت قابلِ عمل (Practicable) نہیں ہے، اس لیے کہ جب ہر شخص کو سود کے بغیر قرض دیا جائے گا تو پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا کہ سب لوگوں کو بغیر سود کے قرضہ دیا جائے؟

سودی قرض کا متبادل ''مشارکت'' ہے

یاد رکھیے کہ انٹرسٹ کا متبادل (Alternative) قرضِ حسنہ نہیں کہ کسی کو ویسے ہی قرض دے دیا جائے، بلکہ اس کا متبادل ''مشارکت'' ہے، یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لیے قرضہ لے رہا ہے تو وہ قرض دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں، اگر تمہیں نفع ہوگا تو اس نفع کا کچھ حصہ مجھے دینا پڑے گا اور اگر نقصان ہوگا تو اس نقصان میں بھی میں شامل ہوں گا تو اس کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں قرض دینے والا شریک ہوجائے گا اور یہ مشارکت ہوجائے گی اور یہ انٹرسٹ کا متبادل طریقہ کار (Alternative System) ہے۔

اور مشارکت کا نظریاتی پہلو تو میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ انٹرسٹ کی صورت میں تو دولت کا بہت معمولی حصہ کھاتہ دار (Depositor) کو ملتا ہے، لیکن اگر مشارکت کی بنیاد پر کاروبار کیا جائے اور سرمایہ کاری (Financing) مشارکت کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں تجارت کے اندر جتنا نفع ہوگا اس کا ایک متناسب (Proportionate) حصہ کھاتہ داروں کی طرف بھی منتقل ہوگا اور اس صورت میں تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth) اوپر کی طرف جانے کے بجائے نیچے کی طرف آئے گا، لہٰذا اسلام نے جو متبادل نظام پیش کیا وہ مشارکت کا نظام ہے۔

مشارکت کے بہترین نتائج

لیکن یہ مشارکت کا نظام چونکہ موجودہ دنیا میں ابھی تک کہیں جاری نہیں

ہے اور اس پر عمل نہیں ہوا اس لیے اس کی برکات بھی لوگوں کے سامنے نہیں آرہی ہیں، ابھی گزشتہ بیس پچیس سال کے دوران مسلمانوں نے مختلف مقامات پر اس کی کوششیں کی ہیں کہ وہ ایسے مالیاتی ادارے اور بینک قائم کریں جو انٹرسٹ کی بنیاد پر نہ ہوں، بلکہ ان کو بھی اسلامی اصولوں کی بنیاد پر چلایا جائے اور شاید آپ کے علم میں بھی یہ بات ہوگی کہ اس وقت پوری دنیا میں اَسّی سے لے کر سو تک ایسے بینک اور سرمایہ کاری کے ادارے قائم ہو چکے ہیں جن کا یہ دعوی ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر اپنے کاروبار کو چلا رہے ہیں، انٹرسٹ سے پاک کاروبار کر رہے ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا دعوی سو فی صد صحیح ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں، لیکن بہرحال! یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں تقریباً ایک سو ادارے اور بینک غیر سودی نظام پر کام کر رہے ہیں اور یہ صرف اسلامی ملکوں میں نہیں، بلکہ بعض مغربی اور یوروپین ممالک میں بھی کام کر رہے ہیں، ان بینکوں اور اداروں نے مشارکہ کے طریقے پر عمل کرنا شروع کیا ہے اور جہاں کہیں مشارکہ کے طریقے کو اپنایا گیا وہاں اس کے بہتر نتائج نکلے ہیں، ہم نے پاکستان میں ایک بینک میں اس کا تجربہ کیا اور میں نے خود اس کی مذہبی نگراں کمیٹی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اس کا معائنہ کیا اور اس میں مشارکہ کے اندر بعض اوقات کھاتہ داروں کو بیس فی صد نفع بھی دیا گیا، لہٰذا اگر مشارکہ کو وسیع پیانے پر کیا جائے تو اس کے نتائج اور بھی زیادہ بہتر نکل سکتے ہیں۔

''مشارکت'' میں عملی دشواری

لیکن اس میں ایک عملی دشواری ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص مشارکہ کی بنیاد پر

بینک سے پیسے لے گیا اور مشارکہ کے معنی نفع اور نقصان میں شرکت (Profit and Loss Sharing) کے ہیں کہ اگر نفع ہوگا تو اس میں بھی شرکت ہوگی اور اگر نقصان ہوگا تو اس میں بھی شرکت ہوگی، تو افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود ہمارے عالمِ اسلام میں بد دیانتی اتنی عام ہے اور بگاڑ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اس بنیاد پر بینک سے پیسے لے کر گیا کہ اگر نفع ہوا تو نفع لا کر دوں گا اور اگر نقصان ہوا تو نقصان بینک کو بھی برداشت کرنا پڑے گا تو وہ پیسے لے کر جانے والا شخص کبھی پلٹ کر نفع لے کر نہیں آئے گا، بلکہ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرے گا کہ مجھے نقصان ہوا ہے اور وہ بینک سے کہے گا کہ بجائے اس کے کہ آپ مجھ سے نفع کا مطالبہ کریں، بلکہ اس نقصان کی تلافی کے لیے مجھے مزید رقم دیں۔

عملی پہلو کا یہ بہت اہم مسئلہ ہے مگر اس کا تعلق اس مشارکہ کے نظام کی خرابی سے نہیں ہے اور اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ مشارکہ کا نظام خراب ہے، بلکہ اس مسئلہ کا تعلق ان انسانوں کی خرابی سے ہے جو اس نظام پر عمل کر رہے ہیں، ان عمل کرنے والوں کے اندر اچھے اخلاق دیانت اور امانت نہیں ہے اور اس کی وجہ سے مشارکہ کے نظام میں یہ خطرات موجود ہیں کہ لوگ بینک سے مشارکہ کی بنیاد پر پیسے لے جائیں گے اور پھر کاروبار میں نقصان دکھا کر بینک کے ذریعے ڈیپازیٹرز کو نقصان پہنچائیں گے۔

اس دشواری کا حل

لیکن یہ مسئلہ کوئی ناقابلِ حل مسئلہ نہیں ہے اور ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کا حل نہ نکالا جاسکے، اگر کوئی ملک اس مشارکہ کے نظام کو اختیار کرے تو وہ بآسانی

یہ حل نکال سکتا ہے کہ جس کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ اس نے بد دیانتی سے کام لیا ہے اور اپنے اکاؤنٹس صحیح بیان (Declare) نہیں کیے تو حکومت ایک مدتِ دراز کے لیے اس کو بلیک لسٹ (Black List) کردے اور آئندہ کوئی بینک اس کو فائنانسنگ کی کوئی سہولت فراہم نہ کرے، اس صورت میں لوگ بد دیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے، آج بھی جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں کام کر رہی ہیں اور وہ اپنے بیلنس شیٹ (Balance Sheet) شائع کرتی ہیں اور اس بیلنس شیٹ میں اگرچہ بد دیانتی بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اپنا نفع وہ اس میں ظاہر کرتی ہیں، اس لیے مشارکہ کو اگر پورے ملک کی سطح پر اختیار کریں تو اس حل کو اختیار کیا جاسکتا ہے، البتہ جب تک مشارکہ کو ملکی سطح پر اختیار نہیں کیا جاتا اس وقت تک انفرادی (Individual) اداروں کو مشارکہ پر عمل کرنا دشوار ہے، لیکن ایسے انفرادی ادارے سلیکٹڈ (Selected) بات چیت کے ذریعے مشارکہ کر سکتے ہیں۔

دوسری متبادل صورت ''اجارہ''

اس کے علاوہ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ اس میں مشارکہ کے علاوہ بینکنگ اور فائنانسنگ کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، مثلاً ایک طریقہ اجارہ (Leasing) کا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص بینک سے پیسہ مانگنے آیا اور بینک نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس ضرورت کے لیے پیسہ چاہیے؟ اس نے بتایا کہ مجھے اپنے کارخانے میں ایک مشینری باہر سے منگا کر لگانی ہے، تو اب بینک اس شخص کو پیسے نہ دے، بلکہ خود اس مشینری کو خرید کر اس شخص کو کرایہ پر دے دے، اس عمل کو اجارہ (Leasing) کہا جاتا

ہے، البتہ آج کل فائنانسنگ اداروں اور بینک میں فائنانشل لیزنگ کا جو طریقہ رائج ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے، اس ایگریمنٹ میں بہت سی شقیں (Clauses) شریعت کے خلاف ہیں، لیکن اس کو شریعت کے مطابق آسانی کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں متعدد فائنانشل ادارے ایسے قائم ہیں جن میں لیزنگ ایگریمنٹ شریعت کے مطابق ہیں اس کو اختیار کرنا چاہیے۔

تیسری متبادل صورت ''مرابحہ''

اسی طرح ایک اور طریقہ ہے جس کا آپ نے نام سنا ہوگا، وہ ہے ''مرابحہ فائنانسنگ'' یہ بھی کسی شخص سے معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے جس میں نفع پر وہ چیز بیچ دی جاتی ہے، فرض کیجیے کہ ایک شخص بینک سے اس لیے قرض لے رہا ہے کہ وہ خام مال (Raw Material) خریدنا چاہتا ہے، وہ بینک اس کو خام مال خریدنے کے لیے پیسے دینے کے بجائے وہ خام مال خود خرید کر اس کو نفع پر بیچ دے، یہ طریقہ بھی شرعاً جائز ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرابحہ کی صورت میں تو ہاتھ گھما کر کان پکڑنے والی بات ہوگئی، کیونکہ اس میں بینک سے نفع لینے کے بجائے دوسرے طریقے نفع وصول کرلیا، یہ کہنا درست نہیں، اس لیے کہ قرآنِ کریم نے فرمایا کہ

وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے اور مشرکینِ مکہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے کہ بیع بھی تو ربا جیسی ہے، اس میں بھی انسان نفع کماتا

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۵)۔

ہے اور ربا میں بھی انسان نفع کماتا ہے، پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے ان کا ایک ہی جواب دیا کہ یہ ہمارا حکم ہے کہ ربا حرام ہے اور بیع حلال ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جاسکتا اور روپیہ پر منافع نہیں لیا جاسکتا، لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز یا مال تجارت آجائے اور اس کو فروخت کرکے نفع حاصل کرے اس کو ہم نے حلال قرار دیا ہے اور مرابحہ کے اندر درمیان میں مال آجاتا ہے اس لیے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا (Transaction) جائز ہوجاتا ہے۔

پسندیدہ متبادل کون سا ہے؟

لیکن جیسا کہ میں عرض کیا کہ یہ مرابحہ اور لیزنگ (Leasing) مطلوبہ اور پسندیدہ متبادل (Ideal alternative) نہیں ہے اور اس سے تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth) پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا، البتہ پسندیدہ متبادل مشارکہ ہے، لیکن آئندہ جو منفرد (Individual) ادارے قائم کیے جائیں ان کے لیے آزمائشی اور تجرباتی مدت (Transitory period) میں مرابحہ اور لیزنگ پر بھی عمل کرنے کی گنجائش موجود ہے اور اس وقت بھی کچھ فائنانشل انسٹیٹیوشن ان بنیادوں پر کام کررہے ہیں۔

بہرحال! یہ تو سود اور اس کے متعلقات کے بارے میں عام باتیں تھیں جو میں نے عرض کردیں۔

سود سے متعلق ایک مسئلہ اور ہے جس کی صدائے بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دارالحرب جہاں غیر مسلم حکومت ہو وہاں

سود کے لین دین میں کوئی قباحت نہیں، وہاں غیر مسلم حکومت سے سود لے سکتے ہیں، اس مسئلے پر بہت لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ چاہے دار الحرب ہو یا دارالاسلام، جس طرح سود دار الاسلام میں حرام ہے اسی طرح دار الحرب میں بھی حرام ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عام آدمی کو چاہیے کہ اپنا پیسہ بینک کے اندر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھے جہاں پیسوں پر سود نہیں لگتا، لیکن اگر کسی شخص نے غلطی سے سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) میں پیسے رکھ دیے ہیں اور اس رقم پر سود مل رہا ہے تو پاکستان میں تو ہم لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ سود کی رقم بینک میں چھوڑ دو، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں ایسی رقم اسلام کے خلاف کاموں پر خرچ ہوتی ہے وہاں اس شخص کو چاہیے کہ وہ سود کی رقم بینک سے وصول کر کے کسی مستحقِ زکوٰۃ شخص کو ثواب کی نیت کے بغیر صرف اپنی جان چھڑانے کے لیے صدقہ کر دے اور خود اپنے استعمال میں نہ لائے۔

عصرِ حاضر میں اسلامی معیشت کے ادارے

ایک بات اور عرض کردوں اور وہ یہ کہ یہ کام نسبتاً ذرا مشکل لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم مسلمانوں کو اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم خود ایسے مالیاتی ادارے قائم کریں جو اسلامی بنیادوں پر کام کریں اور جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے عرض کیا کہ مشارکہ، مرابحہ اور لیزنگ کی مکمل سکیمیں موجود ہیں اور ان بنیادوں پر مسلمان اپنے ادارے قائم کرسکتے ہیں اور یہاں کے مسلمان ماشاء اللہ اس بات کو سمجھتے ہیں اور اس میں خود ان کے مسائل کا بھی حل ہے، ان کو چاہیے کہ یہاں رہ کر فائنانشل انسٹیٹیوٹ قائم کریں۔ امریکہ میں میرے علم کے مطابق کم از کم ہاؤسنگ کی حد تک دو ادارے موجود ہیں اور وہ

صحیح اسلامی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں، ایک ٹورنٹو میں اور ایک لاس اینجلس میں ہے، اب ان اداروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو اپنے طور پر ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں، لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ماہر فقہاء اور مفتی حضرات سے مشورہ کر کے اس کا نظام قائم کریں اور اس سلسلے میں اگر آپ مجھ سے بھی خدمت لینا چاہیں گے تو میں ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہوں، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں سو ادارے کام کر رہے ہیں اور تقریباً ۵ سال سے میں ان اداروں کی خدمت کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس کی توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں کے لیے کوئی بہتر راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
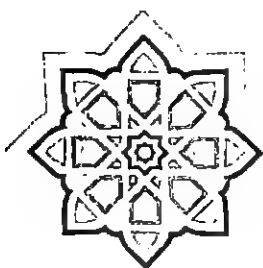
سود لینے سے بخل بڑھتا ہے

(اصلاحی مجالس ۵/۱۰۹ وعظ: بخل اور اس کا علاج)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے کیونکہ سود لینے کا سبب بخل ہے، آدمی جتنا سود لیتا ہے بخل اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرسکتا۔ (انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۱)

''بخل'' کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ

مال کے بڑھنے سے اس سے استغناء پیدا ہو، اس کی حرص اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور مال کی محبت میں اضافہ ہوجاتا ہے، یعنی انسان کو کتنا ہی مال مل جائے وہ اس مال پر قناعت کرنے کے بجائے اور زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ جب مال بڑھ جائے تو طبیعت میں استغناء پیدا ہوجائے، لیکن استغناء بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی خرچ کرنے کا داعیہ زیادہ ہوتا ہے، بلکہ مال کی محبت اور بڑھ جاتی ہے، ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لو كان لابن ادم واديأ من ذهب أحب أن يكون له واديان ولا يملأ جوف ابن أدم إلا التراب"[1]

انسان کا پیٹ قبر کی مٹی بھرے گی

یعنی اگر ابن آدم کو سونے کی بھری ایک وادی مل جائے تو وہ یہ چاہے کہ دو وادیاں مل جائیں اور اگر دو وادیاں سونے کی بھری مل جائیں تو اس کی خواہش ہوگی کہ تین مل جائیں، پھر آخر میں خوبصورت حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا کہ

"ولا يملأ جوف ابن أدم إلا التراب"

یعنی ابن آدم کا پیٹ قبر کی مٹی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔ انسان کا پیٹ اسی وقت بھرے گا جب اس کے اندر مٹی بھرے گی۔ جب تک انسان قناعت پیدا نہ کرے اور مال کی محبت اس کے دل میں ترقی کرتی چلی جائے تو اس کے نتیجے میں اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۸/۹۳ (۶۴۳۹)۔

ایک سوداگر کا واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

آں شنیدہ استی کہ در صحرائے غور
بارِ سالاری بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

یعنی میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں کہ غور کے صحرا میں ایک بہت بڑے سوداگر کا سامان خچر سے گرا پڑا تھا اور وہ خچر بھی مرا ہوا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوا تھا اور وہ سامان جو بکھرا ہوا تھا وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو صرف دو چیزیں بھر سکتی ہیں یا قناعت یا قبر کی مٹی، تیسری کوئی چیز اس کو پُر نہیں کر سکتی۔ بہرحال بخل کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا چلا جاتا ہے اتنی ہی حرص بڑھتی چلی جاتی ہے اور اتنی ہی مال کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے اور خرچ کرنے میں اور زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

ایک بڑے سرمایہ دار کا قول

کراچی میں ایک بڑے سرمایہ دار ہیں اور پاکستان کے مشہور دو چار سرمایہ داروں میں سے ایک ہیں، ارب پتی اور کھرب پتی ہوں گے، ایک دن وہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اللہ نے آپ کو بہت پیسہ دیا ہے، آپ نے بہت سے کارخانے بنائے، فیکٹریاں لگائیں، سب کچھ کر لیا، اب کچھ

کام نفع کی خاطر نہیں، بلکہ اللہ کی خاطر کرلو، وہ یہ کہ تم ایک ایسا بینک قائم کرو جو سود کے بغیر کام کرے، تمہارے پاس چونکہ پیسہ ہے اس لیے تم یہ کام کر سکتے ہو، وہ کہنے لگے کہ مولانا صاحب! وہ بینک پھر کیسے چلے گا؟ میں نے کہا کہ ان شاء اللہ چلے گا، لیکن تم یہ سوچ کر قائم کرو کہ جو پیسہ تم نے اس میں لگادیا وہ گیا، جب اللہ کے فضل سے تمہارے پاس اربوں کھربوں روپیہ موجود ہے تو اگر اس بینک کے قیام پر چند کروڑ روپے لگادو گے تو کیا فرق پڑے گا اور چند کروڑ روپے لگا کر ان کو بھول جاؤ، کہنے لگے کہ ان کو پھر بھول جاؤں، میں نے کہا کہ تم تو بھول جاؤ کہ وہ چند کروڑ روپے کہاں گئے، البتہ اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اس میں نفع بھی عطا فرمادیں گے، لیکن تم اس کو بھول جاؤ، وہ آخر میں کہنے لگے کہ مولانا صاحب! بات تو آپ صحیح کہتے ہو مگر ہاتھ کی کھجلی کو میں کیا کروں!!

غریب اور امیر کے خرچ کرنے میں فرق

یہ ہے مال کو بڑھانے کی کھجلی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بخل بھی پھر رفتہ رفتہ کھجلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، پھر انسان کے پاس کتنا ہی پیسہ آجائے مگر اس کی حرص نہیں مٹتی۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جتنا غریب آدمی دو پانچ روپے اطمینان اور خوش دلی سے دیتا ہے وہ مالدار جس کے پاس اربوں کھربوں روپیہ ہے وہ اتنی خوش دلی سے نہیں دیتا، حالانکہ اس مالدار کے پاس گنجائش زیادہ ہے اور اس غریب کے پاس گنجائش بالکل نہیں، یہ سب حبِ مال کا نتیجہ ہے۔

سود کی ذہنیت بخل پیدا کرتی ہے

اس بخل کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے کیونکہ سود کا مطلب یہ ہے کہ کام کچھ نہ کرو اور نہ کوئی خطرہ مول لو اور پیسے سے اور پیسے بناؤ۔ یہ بخیل کا کام ہے اور سود کی ذہنیت خود انسان کے اندر بخل پیدا کرتی ہے، دنیا میں جتنی سود خور قومیں گزری ہیں سب سے زیادہ کنجوس بھی وہی قومیں ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم یہودی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہودیوں کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ (۱)

اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی۔

آج بھی دنیا کا سارا سودی کاروبار ان یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اور یہی سب سے زیادہ کنجوس قوم ہے اور ساری دنیا میں ان کی کنجوسی کی شہرت ہے۔

یہودی ''شائی لاک'' کا قصہ

آپ نے ''شائی لاک'' کا قصہ سنا ہوگا، یہ روم کے بادشاہ کے زمانے کا قصہ ہے۔ ایک شخص یہودی تھا اس کا نام ''شائی لاک'' تھا، ایک ضرورت مند اس کے پاس پیسے لینے آیا، شائی لاک نے کہا کہ میں سود پر قرض دوں گا، چنانچہ اس

(۱) سورۃ النساء آیت (۱۶۱)۔

نے سود پر قرض دے دیا اور جتنا قرض دیا تھا اس سے ڈیوڑھا سود لگا دیا اور اس سے کہا کہ اتنے دنوں کے اندر ادا کر دینا۔ قرض لینے والا غریب آدمی تھا، وہ اپنے کھانے پینے کی ضرورت کے لیے قرض لے رہا تھا، جب وہ دن پورے ہو گئے اور ادائیگی کی تاریخ آگئی تو شائی لاک اس کے گھر پیسے وصول کرنے پہنچ گیا۔ اس غریب نے کہا کہ میرے پاس تو اس وقت تھوڑے پیسے ہیں، چنانچہ اس نے اس کو کچھ پیسے دے دیے اور کہا کہ اور نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں دے دیتا، شائی لاک نے کہا کہ اچھا وہ سود اب ڈبل ہو گیا اور ادا کرنے کی تاریخ مقرر کر دی، جب دوبارہ وہ تاریخ آئی تو شائی لاک پھر اس کے گھر پہنچ گیا، اس غریب نے کہا کہ تم نے تو سود ڈبل کر دیا، اب میں اس وقت اصل رقم تو دے سکتا ہوں مگر یہ سود کی ڈبل رقم نہیں دے سکتا اس لیے اصل رقم لے لو، اس نے کہا کہ نہیں میں تو پورا سود لوں گا اور اب میں تمہاری مدت نہیں بڑھاؤں گا، اس غریب نے کہا کہ میرے پاس ادا کرنے کے لیے رقم ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں، شائی لاک نے کہا کہ میں ایک اور تاریخ مقرر کرتا ہوں، اگر اس تاریخ پر تم نے روپیہ ادا نہیں کیا تو تمہارے جسم کا ایک پونڈ گوشت نکالوں گا اور اس کو کھاؤں گا اور پیسے الگ لوں گا۔ جب وہ تاریخ آگئی اور وہ غریب سود ادا نہیں کر سکا تو شائی لاک اس کے گھر پر چھری چاقو لے کر پہنچ گیا۔

پیسے کے بدلے انسانی گوشت

وہ غریب آدمی پریشان ہو گیا اور کسی طرح بچتے بچاتے روم کے بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا اور بادشاہ سے کہا کہ شائی لاک میرا گوشت کاٹنے آرہا ہے، چنانچہ اس کے بعد عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کو جیل میں بند کر دیا گیا، شائی

لاک نے عدالت میں بڑی زوردار تقریر کی اور اس تقریر میں اس نے کہا کہ میرے ساتھ آپ انصاف کریں، یہ شخص اتنے دنوں سے ٹال مٹول کر رہا ہے اور پھر اس نے آخر میں خود اپنی رضامندی سے اپنا گوشت کاٹنے کے لیے کہا تھا، اب عدالت کو چاہیے کہ وہ مجھے اس بات کی ڈگری دے کہ اس کا گوشت نکال لوں، اس لیے کہ انصاف کا تقاضا یہی ہے۔

وہ غریب مقروض تو جیل میں بند تھا اور عدالت میں نہیں آسکتا تھا، اس لیے اس کی بیوی عدالت میں آئی اور اس نے عدالت میں تقریر کی، اس تقریر میں اس نے کہا کہ شائی لاک یہ کہتا ہے کہ انصاف دلاؤ اور اس کے کہنے کے مطابق انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مقروض کا گوشت نکال کر کھایا جائے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر ہم سب لوگوں کے ساتھ اللہ انصاف کرنے لگیں تو ہمارا کہاں ٹھکانہ ہوگا؟ اس دنیا میں انصاف ہی سب کچھ نہیں، بلکہ ایک چیز رحم بھی ہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائیں گے تو تب ہم نجات پائیں گے، اس کے بغیر نجات نہیں پائیں گے، چنانچہ بادشاہ نے اس غریب کے حق میں رحم کی بنیاد پر فیصلہ سنادیا، بہرحال! شائی لاک کی طرح یہودی قوم ساری دنیا میں بخیل مشہور ہے۔

ہندو سود خور قوم

دنیا میں دوسری سب سے بڑی سود خور قوم ہندو ہے۔ ہندو بنیا مشہور ہے، ہندوستان کے ہندو تاجر کو ''بنیا'' کہا جاتا ہے، ان کو ''مہاجن'' بھی کہتے ہیں، یہ سود لے کر کھانے والے ہیں، ان کی کنجوسی ضرب المثل ہے، ان کے ہاں ایک ایک پائی کا حساب وکتاب ہوتا ہے۔

ہندی کی ایک ضرب المثل

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی ایک بڑے مزے کی ضرب المثل سنایا کرتے تھے، وہ یہ کہ

لالہ جی گئے پاؤنے، چار دن میں آئے، لالہ جی کے گھر آگئے چار پاؤنے، لالہ جی نہ گئے نہ آئے۔

ہندو بنیے کو ''لالہ جی'' کہا جاتا تھا، ''پاؤنے'' کے معنی ہیں مہمان، یعنی لالہ جی کسی کے گھر مہمان بن کر چلے گئے اور چار دن اس کے گھر قیام کیا اور چار دن کے بعد واپس آئے، اس طرح چار دن کا خرچ بچ گیا، پھر ایک دن لالہ جی کے گھر چار مہمان آگئے، اب جو کچھ چار دن کے کھانے کی بچت ہوئی تھی وہ برابر ہوگئی، اس لیے لالہ جی نہ گئے نہ آئے، بہرحال! ان کا اس طرح کنجوسی کا حساب وکتاب جاری رہتا ہے کہ ایک پائی نہ جانے پائے، درحقیقت یہ سود کی وہ ذہنیت ہے جو کنجوسی پیدا کرتی ہے۔

مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں

یاد رکھیے! جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پرواہ نہیں، اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے پاس جتنا پیسہ بڑھتا چلا جائے گا اتنی ہی اس کی حرص بڑھے گی اور پیسے خرچ کرتے ہوئے اس کی اتنی ہی جان نکلے گی۔ غریب آدمی اطمینان سے پیسہ خرچ کردے گا، لیکن یہ بڑا سرمایہ دار جو سرمایہ پر سانپ بن کر بیٹھا ہے وہ خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ یاد رکھیے! یہ مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں اور بخل کے نتیجے میں حب مال اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ دعا کثرت سے کریں

اس سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی اپنے آپ کو شریعت کا تابع بنائے اور قناعت دل میں پیدا کرے اور یہ دعا کرے کہ اے اللہ! جائز اور حلال طریقے سے جتنا آپ مجھے عطا فرمادیں گے میرے لیے وہی نعمت ہے اور یہ دعا کرے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ

اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاخْلُفْ عَلٰى كُلِّ غَائِبَةٍ لِيْ مِنْكَ بِخَيْرٍ (۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک لفظ پر آدمی قربان ہوجائے۔ فرمایا کہ اے اللہ! جو کچھ رزق آپ نے عطا فرمایا ہے مجھے اس پر قناعت عطا فرمایئے اور مجھے اس میں برکت دے دیجیے، جب تھوڑے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمادیتے ہیں اور پھر وہ لاکھوں اور کروڑوں سے زیادہ فائدہ پہنچادیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق میں برکت نہ ہو تو پھر کروڑوں اور لاکھوں بھی بے کار ہوجاتے ہیں، ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، آگے فرمایا کہ اے اللہ! جو مال میرے پاس موجود نہیں ہے اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو، یعنی میں کتنا بھی غور وفکر کرلوں کہ میرے لیے کیا چیز اچھی اور کیا چیز بری ہے، لیکن میری محدود فکر اور میری محدود سوچ کبھی بھی

(۱) صحیح ابن خزیمہ ۲۱۷/٤ (۲۷۲۸) طبع المکتب الاسلامی بیروت۔ والمستدرک للحاکم ۶۹۰/۱ (۱۸۷۸) وقال هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه و ۳۳۸/۲ (۳۳۶۰) وصححه ووافقه الذهبی فی "التلخیص"۔

حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی، لہٰذا اے اللہ! یہ معاملہ میں آپ کے اوپر چھوڑتا ہوں۔ یا اللہ! جو چیز میرے پاس نہیں ہے اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو۔

حلال طریقے سے مال میں اضافے کی کوشش کرنا جائز ہے

لیکن یہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ سے قناعت کی دعا تو کریں، لیکن جائز اور حلال طریقے سے اس مال میں اضافے کی کوشش کرنا قناعت کے منافی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارت کی ترغیب بھی عطا فرمائی ہے، اگر حلال طریقے سے مال بڑھانا قناعت کے خلاف ہوتا تو آپ تجارت کی ترغیب نہ دیتے، اس سے پتہ چلا کہ حلال طریقے سے مال کو بڑھانے کی اجازت ہے مگر یہ سوچتے ہوئے کہ جائز اور حلال طریقے سے اللہ تعالیٰ جتنا عطا فرمائیں گے وہ نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے استعمال کریں گے اور ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی فکر دل میں کبھی پیدا نہیں کریں گے اور اس مال کی محبت کو دل پر غالب نہیں ہونے دیں گے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

رشوت کا گناہ

جنگ ۲۶ مئی ۱۹۷۸ء
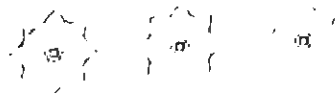
بسم اللہ الرحمن الرحیم

رشوت کا گناہ

رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے

بعض برائیاں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہوسکتی ہیں ایک شخص کے نزدیک وہ برائی ہے اور دوسرا اسے کوئی عیب نہیں سمجھتا، لیکن رشوت ایک ایسی برائی ہے جس کے بُرا ہونے پر ساری دنیا متفق ہے۔ کوئی مذہب وملت، کوئی مکتبِ فکر یا انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ملے گا جو رشوت کو بدترین گناہ یا جرم نہ سمجھتا ہو۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ دن کے وقت دفتروں میں بیٹھ کر دھڑلے سے رشوت کا لین دین کرتے ہیں، وہ بھی جب شام کو کسی محفل میں معاشرے کی خرابیوں پر تبصرہ کریں گے تو ان کی زبان پر سب سے پہلے رشوت کی گرم بازاری ہی کا شکوہ آئے گا اور اس کی تائید میں وہ (اپنے نہیں) اپنے رفقائے کار کے دوچار واقعات سنا دیں گے، سننے والے یا تو ان واقعات پر ہنسی مذاق میں کچھ فقرے چست کردیں گے یا پھر کوئی بہت سنجیدہ محفل ہوئی تو اس میں غم وغصہ کا اظہار کیا جائے گا، لیکن اگلی

ہی صبح سے یہی شرکائے مجلس پورے اطمینان کے ساتھ اسی کاروبار میں مشغول ہوجائیں گے۔

غرض رشوت کی خرابیوں سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود کوئی شخص جو اس انسانیت سوز حرکت کا عادی ہوچکا ہو اسے چھوڑنے کے لیے تیار نظر نہیں آتا اور اگر اس کے بارے میں کسی سے کچھ کہا جائے تو مختصر سا جواب یہ ہے کہ ساری دنیا رشوت لے رہی ہے تو ہم کیا کریں؟ گویا ان کے نزدیک رشوت چھوڑنے کی شرط یہ ہے کہ پہلے دوسرے تمام لوگ اس برائی سے تائب ہوجائیں تب ہی چھوڑنے پر غور کرسکتا ہوں، اس کے بغیر نہیں اور چونکہ رشوت لینے والے کے پاس بھی بہانہ ہے، لہٰذا یہ تباہ کن بیماری ایک وبا کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو وہاں کوئی مریض یہ سوال نہیں کرتا کہ جب تک تمام دوسرے لوگ تندرست نہ ہوجائیں میں بھی صحت کی تدبیر نہیں کروں گا، لیکن رشوت کے بارے میں یہ استدلال ناقابلِ تردید سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک استدلال نہیں، ایک بہانہ ہے اور بات صرف یہ ہے کہ رشوت لینے والے کو اپنے اس عمل میں فوری طور سے کافی فائدہ ہوتا نظر آتا ہے، اس لیے نفس اس فائدے کو حاصل کرنے کے لیے ہزار حیلے بہانے تراش لیتا ہے، لیکن آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ رشوت لینے میں واقعتاً کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں؟ بظاہر تو رشوت لینے میں یہ کھلا فائدہ نظر آتا ہے کہ ایک شخص کی آمدنی کسی زائد محنت کے بغیر بڑھتی جاتی ہے، لیکن اگر ذرا باریک بینی سے کام لیا جائے تو اس وقتی فائدے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک ٹائیفائڈ میں

مبتلا بچے کو چٹ پٹی غذاؤں میں بڑا لطف آتا ہے لیکن بچے کے ماں باپ یا اس کے معالج جانتے ہیں کہ یہ چند لمحوں کا فائدہ نہ صرف اس کی تندرستی کو دور سے دور تر کردے گا بلکہ انجام کار اسے زیادہ طویل عرصہ تک لذیذ غذاؤں سے محروم ہوجانا پڑے گا۔

یہ مثال صرف رشوت کے اخروی نقصانات پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو رشوت کے دنیوی نقصانات کے بارے میں بھی اتنی ہی سچی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب معاشرے میں یہ لعنت پھیل جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی ایک جگہ سے کوئی رشوت وصول کرتا ہے تو اسے دسیوں جگہ خود رشوت دینی پڑتی ہے، بظاہر تو وہ ممکن ہے کہ اسے آج سو روپے زیادہ ہاتھ آگئے لیکن کل جب اسے خود دوسرے لوگوں سے کام پڑیگا تو یہ سو روپے نہ جانے کتنے سو ہوکر خود اس کی جیب سے نکل جائیں گے۔

پھر رشوت کا یہ نقد نقصان کیا کم ہے کہ اس کی بدولت پورا معاشرہ بدامنی اور بے چینی کا جہنم بن جاتا ہے کیوں کہ کسی بھی ملک میں باشندوں کے امن وسکون کی سب سے بڑی ضمانت اس ملک کا قانون اور اس قانون کے محافظ ادارے ہی ہوسکتے ہیں، لیکن جس جگہ رشوت کا بازار گرم ہو وہاں بہتر سے بہتر قانون بھی بالکل مفلوج اور ناکارہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ آج ہم معاشرے کی بدامنی کو ختم کرنے کے لیے کوئی قانون بنانے بیٹھتے ہیں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ اس قانون کو رشوت کے زہر سے کیسے بچایا جائے؟ چوری، ڈاکے، قتل، اغواء، بدکاری اور دھوکے فریب کے انسانیت کش حادثات سے آج ہر شخص سہما ہوا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتا کہ ان حادثات کے روز افزوں

ہونے کا سبب درحقیقت وہ رشوت ہے جو ہر اچھے سے اچھے قانون کو چند نوٹوں کے عوض بیچ کر اس کی ساری افادیت کو خاک میں ملادیتی ہے اور جسے ہم نے اپنے روزمرہ کے طرزِعمل سے شیر مادر بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہم نے اگر کسی مجرم سے رشوت لے کر اسے قانون کی گرفت سے بچالیا ہے تو درحقیقت ہم نے جرم کی اہمیت، قانون کے احترام اور سزا کی ہیبت کو دلوں سے نکالنے میں مدد دی ہے اور ان مجرموں کا حوصلہ بڑھایا ہے جو کل خود ہمارے گھر پر ڈاکہ ڈال سکتے ہیں۔

ایک سرکاری افسر کسی سرکاری ٹھیکہ دار سے رشوت لے کر اس کے ناقص تعمیری کام کو منظور کرادیتا ہے اور مگن ہے کہ آج آمدنی زیادہ ہوگئی، لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ جس ناقص پل کی تعمیر پر اس نے صاد کرادیا ہے کل جب گرے گا تو اس کی کی زد میں خود وہ اور اس کے بچے بھی آسکتے ہیں، جس ناقص مال کی بنی ہوئی سڑک اس نے منظور کرادی ہے وہ ہزارہا دوسرے افراد کی طرح خود اس کے لیے بھی عذاب جان بنے گی، اور سب سے بڑھ کر یہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں رشوت کے عام لین دین سے ہم نے سرکاری خزانے کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا بار کوئی حکمران ہی نہیں اٹھائے گا، بلکہ اس کے نتائج زائد ٹیکسوں کی شکل میں ملک کے تمام باشندوں کو بھگتنے پڑیں گے جن میں ہم خود بھی داخل ہیں اس سے ملک میں گرانی بھی پیدا ہوگی، خزانہ بھی کمزور پڑے گا، ملک کے ترقیاتی کام بھی رکیں گے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی منزل بھی دور ہوگی، اور دوسری اقوام ہمیں بدستور لقمۂ تر سمجھتی رہیں گی۔

یہ تو چند سرسری سی مثالیں تھیں، لیکن اگر ہم ذرا اس رخ سے مزید سوچیں تو اندازہ ہو کہ رشوت کے لین دین کی بدولت ہم خود دنیا میں مستقل طور سے

کن پیچیدہ مصائب اور سنگین مشکلات میں مبتلا ہو گئے ہیں؟ رشوت کے یہ دنیوی نقصانات تو اجتماعی نوعیت کے ہیں اور بالکل سامنے کے ہیں، لیکن اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو خاص رشوت لینے والے کی انفرادی زندگی بھی رشوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہتی۔ حدیث میں ہے کہ:

لعن رسول الله ﷺ الراشي والمرتشي والرائش [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے رشوت دینے والے پر بھی، رشوت لینے والے پر بھی اور رشوت کے دلال پر بھی۔

جس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کی ہو [2] اس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی شخص پر لعنت بھیجنا معمولی بات نہیں۔ اس کا اثر آخرت میں تو ظاہر ہوگا ہی، لیکن دنیا میں بھی یہ لوگ اس لعنت کے اثر سے بچ نہیں سکتے۔ چنانچہ جو لوگ معاشرے کو تباہی کے راستے پر ڈال کر حق داروں کا دل دکھا کر غریبوں کا حق چھین کر اور ملت کی کشتی میں سوراخ کر کے رشوت لیتے ہیں۔ بظاہر ان کی آمدنی میں خواہ کتنا اضافہ ہوجاتا ہو، لیکن خوشحالی اور راحت وآسائش روپے پیسے کے ڈھیر، عالیشان کوٹھیوں، شاندار کاروں اور اپ ٹو ڈیٹ فرنیچر کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کے اس سکون اور روح کے اس قرار اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جسے کسی بازار سے کوئی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی نہیں خریدا جاسکتا، یہ صرف اور صرف اللہ کی دَین

---

(۱) مسند احمد ۸۵/۳۷ (۲۲۳۹۹) وقال المناوی فی "التیسیر بشرح الجامع الصغیر" ۲۹۲/۲ باسناد حسن۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں صحیح البخاری ۱۷۵/٤ (۳٤۷۷)۔

ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو یہ دولت دیتا ہے تو ٹوٹے جھونپڑے، کھجور کی چٹائی اور ساگ روٹی میں بھی دے دیتا ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو شاندار بنگلوں، کاروں اور کارخانوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

آج اگر آپ کو رشوت کے ذریعے کچھ زائد آمدنی ہوگئی ہے، لیکن ساتھ ہی کوئی بچہ بیمار پڑ گیا ہے تو کیا یہ زائد آمدنی آپ کو کوئی سکون دے سکے گی؟

آپ کی ماہانہ آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، لیکن اگر اسی تناسب سے گھر میں ڈاکٹر اور دوائیں آنے لگی ہیں تو آپ کو کیا ملا؟ اور اگر فرض کیجئے کہ کسی نے مرمرا کر رشوت کے روپے سے تجوریاں بھر لیں، لیکن اولاد نے باغی ہوکر زندگی اجیرن بنادی، داماد نے جینا دوبھر کردیا، یا اسی قسم کی کوئی اور پریشانی کھڑی ہوگئی تو کیا یہ ساری آمدنی اسے کوئی راحت پہنچا سکے گی؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے باغی ہوکر روپیہ تو جمع کرسکتا ہے لیکن اس روپے کے ذریعے راحت وسکون حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں، عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت پریشانیوں اور آفتوں کا ایسا چکر لے کر آتی ہے جو عمر بھر انسان کو گردش میں رکھتا ہے قرآن کریم میں ہے:

> "جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ ایسے مصائب کا شکار کردیئے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں لذیذ سے لذیذ غذا بھی آگ معلوم ہوتی ہے"[1]۔

---

(۱) إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا سورۃ النساء آیت (۱۰)۔

لہٰذا رشوت خوروں کے اونچے مکان اور شاندار اسباب دیکھ کر اس دھوکے میں نہ آنا چاہئے کہ انہوں نے رشوت کے ذریعے خوش حالی حاصل کرلی، بلکہ ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر افراد کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔اس کے برعکس جو لوگ حرام سے اجتناب کرکے اللہ کے دیئے ہوئے حلال رزق پر قناعت کرتے ہیں، ابتداء میں انہیں کچھ مشکلات پیش آسکتی ہیں، لیکن مآل کار دنیا میں بھی وہی فائدے میں رہتے ہیں، ان کی تھوڑی سی آمدنی میں بھی زیادہ کام نکلتے ہیں، ان کے اوقات اور کاموں میں بھی برکت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دل کے سکون اور ضمیر کے اطمینان کی دولت سے مالامال ہوتے ہیں۔

اوپر رشوت کے جو نقصانات بیان کئے گئے وہ تمام تر دنیوی نقصانات تھے، اور اس لعنت کا سب سے بڑا نقصان آخرت کا نقصان ہے، دنیا میں اور ہزار چیزوں میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن اس بارے میں کسی مذہب اور کسی مکتب فکر کا اختلاف نہیں کہ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت ضرور آئے گی اگر بالفرض رشوتیں لے لے کر کسی شخص نے چندروز مزے اڑا بھی لیے تو بالآخر اس کا انجام سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

الراشی والمرتشی فی النار(۱)

رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا (دونوں) جہنم میں ہوں گے۔

---

(۱) المعجم الصغير للطبرانی ۵۷/۱ (۵۸) طبع المکتب الاسلامی بیروت۔والحدیث ذکرہ الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۲۵۹/٤ (۷۰۲۷) وقال رواہ الطبرانی فی الصغیر ورجالہ ثقات۔

اور اس لحاظ سے رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ شراب نوشی اور بدکاری سے اگر کوئی شخص صدق دل کے ساتھ توبہ کرلے تو وہ اسی لمحے معاف ہوسکتا ہے، لیکن رشوت کا تعلق چونکہ حقوق العباد سے ہے، اس لیے جب تک ایک ایک حقدار کو اس کی رقم نہ چکائے یا اس سے معافی نہ مانگے، اس گناہ کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، عام طور سے جب انسان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اسے اپنی آخرت کی فکر لاحق ہوہی جاتی ہے، اگر اس وقت عارضی دنیوی مفاد کے لالچ میں ہم یہ گناہ کرتے رہے تو یقین کیجئے کہ موت سے پہلے ہی جب آخرت کی منزل سامنے ہوگی تو یہ اعمال دنیا کے ہر آرام وراحت کو مستقل عذابِ جان بنا کر رکھ دیں گے اور اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر تنہا میں نے رشوت ترک کردی تو اس سے پورے معاشرے پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن یہی وہ شیطان کا دھوکہ ہے جو معاشرے سے اس لعنت کے خاتمے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب ہر شخص دوسرے کا انتظار کرے گا تو معاشرہ کبھی اس لعنت سے پاک نہیں ہوگا۔ آپ رشوت کو ترک کرکے کم ازکم خود اس کے دنیوی اور آخرت کے نقصانات سے محفوظ ہوسکیں گے، اس کے بعد آپ کی زندگی دوسروں کے لیے نمونہ بنے گی، کیا بعید ہے کہ آپ کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس لعنت سے تائب ہوجائیں۔ تاریکی میں ایک چراغ جل اٹھے تو پھر چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ تناور ہوسکتا ہے کہ اس سے پورا ماحول بقعہ نور بن جائے پھر جب کوئی شخص اللہ کے لیے اپنے نفس کے کسی تقاضے کو چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس

کے شامل حال

ہوتی ہے، دور دور سے ایک کام کو مشکل سمجھنے کے بجائے اسے کرکے دیکھیے، اللہ تعالیٰ سے اس کی آسانی کی دعا مانگیے۔ ان شاء اللہ اس کی مدد ہوگی ضرور ہوگی، بالضرور ہوگی اور کیا عجب ہے معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو منتخب کیا ہو۔

مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر و مضامین کا
موضوع وار مجموعہ
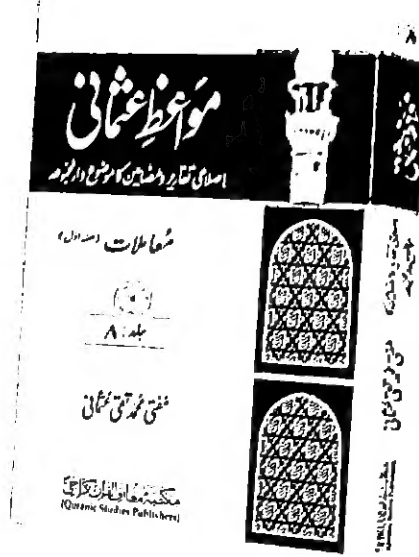
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شُعب الایمان
- نشری تقریریں
- فردکی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکر وفکر
- the Islamic Months

اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریرِ ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شامل شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔

مکتبۂ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)